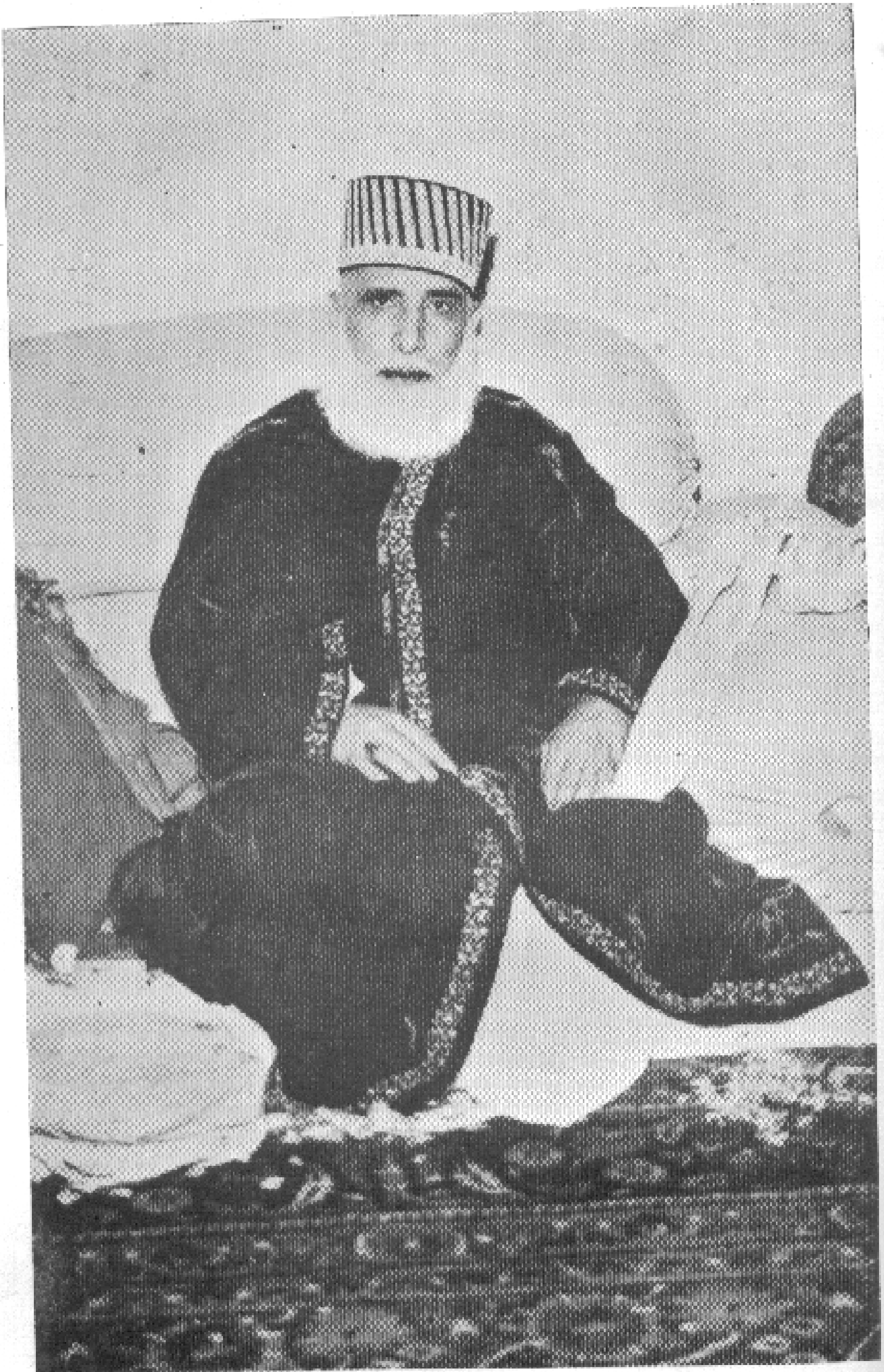
آیاتِ جمال

ذہین شاہ تاجی



 محمد طاسین شاہ ذہین تاجی

فہرست

انتساب

ایک ایسی صورت جس میں سب صورتیں جمع ہیں
ایک ایسا حسن جس میں سب حسن جمع ہیں
ایک ایسی حقیقت جس میں سب حقائق جمع ہیں
ایک ایسی شان جس میں سب شانیں جمع ہیں
ایک ایسی ذات جس میں سب صفات جمع ہیں
ایک ایسا رنگ جس میں سب رنگ جمع ہیں

میرا مطلوب تھا۔۔۔۔ مگر وہ مجھ سے ایسی جامع نظر کا طالب تھا جو ہر صورت میں اس کو دیکھے۔

ایک صورت میں سب صورتوں کو دیکھے
ہر حسن میں اسی کے حسن کو دیکھے
ایک حسن میں ہر حسن کو دیکھے
ہر رنگ میں اسی کے رنگ کو دیکھے
ایک رنگ میں ہر رنگ کو دیکھے

میں اس مطالبہ سے سوچ میں پڑ گیا۔ دریائے فکر میں ڈوب گیا خیالات میں طوفان تھا۔ تموج تھا۔ مدوجذر تھا۔ اس نے کہا۔ تمام خیالات کو جمع کر کے ایک خیال بناؤ۔ تمام افکار کو جمع کر کے ایک فکر بناؤ تمام اجزاء کو جمع کر کے ایک کل بناؤ۔

کام بہت مشکل تھا مگر طلب صادق نے یہ مشکل آسان کردی مشکل بھی خیالی تھی۔ آسانی بھی خیالی تھی۔ خیالی نہیں واقعی تھی تو واقعہ بھی خیال ہی میں واقع تھا۔ خیال شدت توجہ سے واقعہ بن جاتا ہے اور بے توجہی سے واقعہ بھی خیال ہوجاتا ہے۔ میرے لئے محبوب کا خیال شدت توجہ سے واقعہ بن گیا۔ واقعی ہوگیا۔

اب اس کو خیال محبوب کہئے یا محبوب خیال۔ خیال معبود کہئے یا معبود خیال۔ خیال حسن کہئے یا حسن خیال۔ خیال صورت کہئے یا صورت خیال۔ خیال رنگ کہئے یا رنگ خیال۔

BZSTRFT

خیال کل کہئے یا کل خیال۔

میں نے دیکھا سب اضافتیں ایک اضافت میں جمع ہیں۔

میں نے دیکھا سب نسبتیں ایک نسبت میں جمع ہیں

سب زمانے زمان واحد میں کس نے دیکھے؟ میں نے دیکھے

سارے مکان ایک مکان میں دیکھنے والا کون ہے؟ میں ہوں

ساری صورتیں ایک صورت میں دیکھنے والا میں ہوں

سارے روپ ایک روپ میں کس نے دیکھے؟ میں نے دیکھے

میں نے ایک کو دیکھ کر سب کچھ دیکھا' سب کچھ دیکھ کر میں نے ایک ہی کو دیکھا اس دیکھنے میں جو لذت تھی اس میں سب لذتیں جمع تھیں۔

اس دیکھنے میں جو کیف تھا اس میں تمام کیف جمع تھے ۔

اس دیکھنے میں جو سرور تھا اس میں سب سرور جمع تھے ۔

یہ کیفیت تمام کیفیات کو جامع تھی یہ تمام کیفیات جو مختلف اور متضاد ہونے کے اعتبار سے کبھی ایک نقطہ پر جمع نہیں ہو سکتیں میری "انا" میں جمع ہو گئیں۔

آیات جمال ان کیفیات کا ایک جامع نام ہے۔ آیات جمال کی اضافی کثرت جمال آیات کی حقیقی وحدت سے معنون ہے۔

فقیر محمد طاسین شاہ

ذہین تاجی عفی عنہ

تاج منزل ۲۸-۱-۶۷ء کراچی

شکریہ

میں اپنے ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آیات جمال کی جمع و ترتیب تدوین واشاعت میں فعال عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فقیر محمد طاسین شاہ

ذہین تاجی عفی عنہ

حضرت جوش

اصنداد کی ہم آغوشی کے عنوان سے جن حقائق متضادہ کو پیش کیا گیا ہے ان کا رسمی شکریہ ادا کرتے وقت مجھے اس حقیقی شکوے کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے۔

ہمہ عمر باتو قدح زدیم ونہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

یہ وہی شکوہ ہے جو شبیر حسن خان کو جوش سے ہے۔

فقیر ذہین شاہ تاجی عفی عنہ

حضرت رزی

مجھے اپنے مخلص دوست مولانا رزی صاحب کی اس محبت اور محنت کا اعتراف کرنا چاہئے جو آیات جمال کے مقدمہ کی صورت میں ظاہر ہے۔

مقدمہ شرح و بسط کے ساتھ نہایت فاضلانہ اور محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے یہ دوسو کئی صفحات پر مشتمل ہے جو علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو گا۔

اس کے اقتباسات اس غرض سے شریک اشاعت ہیں کہ ان سے آیات جمال کے علمی مطالعہ میں مدد ملے گی۔

فقیر ذہین شاہ تاجی

مقدمہ

میرے عزیز ترین دوست حضرت ذہین شاہ تاجی کے کلام کا مسودہ میرے سامنے ہے اور میں ارادہ کر رہا ہوں کہ اس پر کچھ لکھوں بڑی مشکل یہ ہے کہ ذہین صاحب کے کلام پر قلم اٹھانے سے پہلے جب میں سوچتا ہوں کہ ذہین صاحب کون ہیں اور ان کا کلام کیا ہے اور کیسا ہے تو پچھلے چالیس سال کا زمانہ ماضی' حال میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے اور تصاویر متحرکہ کی طرح نہیں بلکہ بیک وقت چالیس سال کا زمانہ ہتھیلی کی طرح پیش نظر آجاتا ہے اور ذہن میں یہ کشمکش پیدا ہوتی ہے کہ کیا لکھنا چاہئے اور کس طرح لکھنا چاہئے آخر میں' میں نے یہ طے کیا کہ ذہین کی سوانح حیات کا لکھنا خود موصوف کے ذمے رکھا جائے اور سب سے پہلے شعروشاعری کے متعلق کچھ سوچا جائے۔

قبل اس کے کہ میں آیات جمال کے متعلق اظہار خیال کروں بعض ایسے حقائق کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو فکری اور نفسیاتی طور پر اس ماحول کی تخلیق کے محرک ہوتے ہیں جو "آیات جمال" میں نظر آتا ہے۔

ذہین صاحب سلطان التارکین حضرت صوفی حمید الدین ناگوری (رح) سے دوگونہ تعلق رکھتے ہیں سلسلہ نسب کے لحاظ سے اور خانوادہ طریقت کے اعتبار سے یہ دونوں نسبتیں ایسی ہیں جن کا تاثر اضطراراً و اختیاراً آیات جمال میں نظر آتا ہے۔

ذہین صاحب نے جن والد بزرگوار کی آغوش میں آنکھیں کھولیں وہ علم و فضل و مشیت سے جہاں موصوف تھے وہاں شعروشاعری میں بھی خصوصی امتیاز کے مالک تھے۔

ذہین صاحب کے تربیت سلوک میں جذب کو بھی بڑا دخل ہے انکے شیخ طریقت حضرت مولانا عبدالکریم صاحب العروف بابا یوسف شاہ تاجی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ جو میرے روحانی سرپرست ہیں حضرت بابا تاج الدین ناگپوری علیہ الرحمتہ سے فیض یافتہ تھے اور حضرت بابا تاج الدین اپنے زمانے کے راس المجاذیب اور ابوالوقت درویش تھے۔

ذہین صاحب جب اس سلسلہ عالیہ یوسفیہ تاجیہ میں داخل ہوئے تو دو ڈھائی سال تک ان پر یہ کیفیت طاری رہی کہ کفنی پہنے رہتے' ٹوپی اور جوتے سے قطعا" بے نیاز تھے حتیٰ کہ

۱۹۳۵ء کے آل انڈیا مشاعرہ جے پور میں اسی ہیت کذائی سے شریک ہوئے وہ اس وقت دنیا ومافیہا سے عملاً بے خبر محو اور مستغرق تھے زندگی کے اس ٹکڑے کی جھلکیاں بھی آپ ان کے کلام میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

عرفان سلسلہ فقروتصوف کی ایک اصطلاح ہے لفظ "عرفان" کی اصطلاحی حیثیت اپنے مضمرات کو چھپانے سے قاصر ہے۔

سلسلہ فقروتصوف میں ہمارے سامنے دو بڑی شخصیتیں آتی ہیں۔ ان میں ایک حضرت خواجہ میر درد کی ذات گرامی ہے اور دوسری حضرت شاہ نیاز احمد' نیاز بے نیاز بریلوی کی ذات والا صفات۔

آخر زمانے میں جناب اصغر گونڈوی نے تصوف کہا اور خوب کہا اور کہنے کا حق ادا کیا یا پھر چوتھی شخصیت مولوی سید محمد علی شاہ صاحب میکش اکبر آبادی کی ہے لیکن ان کے کلام میں تصوف کا رنگ' چونکہ مجاز کے پردے میں تجلیاں دکھاتا ہے' اس لئے اس جامعیت نے کلام کو بیحد جاذب اور اہل نظر و صاحبان ذوق اور خستہ دلان سینہ مجروح کے لئے ایسا بنا دیا ہے کہ وہ اگر آہ کرتے ہیں تو واہ دامن گیر ہوتی ہے اور اگر بے تابانہ واہ کرتے ہیں تو آہ غضبناک نظر آتی ہے۔

اسی موجودہ زمانے میں جس میں اصغر مرحوم کا کافی وقت آجاتا ہے اور جناب میکش اکبر آبادی کے انفاس گرم دلوں میں بجلیاں پیدا کرتے ہیں "ذہین صاحب" کا دور بھی گروش کرتا نظر آتا ہے۔

ذہین صاحب کی شاعری کیا ہے واردات وکیفیات کا مرقع ہے ذہین صاحب رسما" بھی ایسا شعر نہیں کہتے جو آپ بیتی نہ ہو۔

ذہین صاحب کے کلام پر رائے زنی کرنے کے لئے ڈاکٹر زور قادری یا کلیم الدین احمد کے علم کی ہرگز ضرورت نہیں ہے بلکہ شبلی وحالی کے دل ودماغ اور اقبال کے فکر کی ضرورت ہے ذہین صاحب کا کلام ان تمام متعلقات کا مجموعہ ہے جن سے حیات انسانی گزرتے ہوئے اپنے تاثرات چھوڑ جاتی ہے اور ایسے وجدان کی ضرورت ہے جو رومی وعطار کو بارگاہ فطرت سے عطا ہوا تھا۔

کسی کلام پر تبصرہ وتنقید کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے ذرا سی ذکاوت اور ترتیب

BZSTRFT

خیالات سے کام نکل جاتا ہے لیکن کلام میں اگر ایسا تنوع ہو کہ ناقد سے اس کی تخصیص مشکل ہو جائے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ شاعر کا اصل رنگ کیا ہے اس کے شعر کا مزاج طبعی کیا چیز ہے تو یہی آسان کام مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر ایسی حالت میں کہ خود صاحب کلام سے ایسا تعلق ہو کہ اس کے خیال کی مرکزیت تبصرہ نگار سے پوشیدہ نہ ہو۔

رہا" یہ کہنا بہت آسان ہے کہ ذہین صاحب صوفی شاعر ہیں ان پر تصوف کا کافی غلبہ ہے مگر اپنے علم کی حد تک، میں اس خیال کو ذہین صاحب پر ظلم سے کم نہیں سمجھتا بلکہ ان کے کلام میں جس حسن و نظم کے ساتھ دلکش انداز میں ٹکسالی تصوف پایا جاتا ہے اسی کمال کے ساتھ، ان کے تغزل میں حسن و شباب، عشق و سرمستی کی بجلیاں، آندھیاں اور زلزلے بھی پائے جاتے ہیں ذہین صاحب کی ہنگامہ خیز شاعری میں جہاں حقیقت و مجاز کا رچاؤ، ایک ہی نقطے پر جمع ہو جاتا ہے ان کی شاعری، معاصرین سے انہیں ممتاز کر دیتی ہے۔

اگر آپ آیات جمال کا مطالعہ ذرا غور سے کریں گے تو ہر شعر واقعات اور تغیرات کا ایک زمانہ نظر آئے گا۔ ان شعروں میں نفسیاتی تصاویر، دماغی لوح کے نقش و نگار، عبارت موزوں میں نظر آئیں گے فکری عروج، جذباتی عمق، احساس کی تلملاہٹ آپ اس طرح دیکھیں گے جو چھپائے نہ چھپ سکے وجدان کا انفعال، ادراک کی وسعت، ارادوں کا زور، آہوں کی بجلیاں، مسرتوں کی گھٹائیں، خیالات کے چمن اور صحرا اپنی اپنی جگہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست" کا تماشا دکھاتے ہیں۔

آیات جمال میں ایک خاص قسم کا حسن اور نظر آتا ہے اس میں جن داخلی اور خارجی حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کا ایک جامع نام اور بھی ہے "عرفان" عرفان مطلق جس کی آغوش اطلاق کے دامن میں عرفان نفس سے عرفان آفاقی تک دونوں آسودہ ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شاعری ہے جس کا وجود اردو، فارسی زبانوں کے سوا، دنیا کی کسی زبان میں پایا ہی نہیں جاتا اگر ہم اردو زبان کو فلسفیانہ ماحول کی بناء پر تمام دنیا کی زندہ زبانوں سے الگ ایک زندہ زبان ثابت کرنا چاہیں تو غزل اور صرف غزل ہی وہ صنف ثابت ہوگی جس کو مابہ الامتیاز صنف قرار دے سکیں اور اردو زبان کو دنیا کی تمام زبانوں میں زندہ زبان کہا جا سکے۔

غزل اصناف شعر میں ایک ممتاز صنف ہے اس کا مزاج ایسا ہے جو متفرق اور مفرد

مضامین سے ہم آہنگی رکھتا ہے تسلسل غزل کا مزاج نہیں اس لئے اصناف کلام میں سے تمام اصناف میں متفرق احساسات اور مختلف جذبات کے اظہار کے لئے غزل بہترین صنف ہے غزل کا ایک ایک شعر، ایک مستقل ایسے واقعے کا نمائندہ ہوتا ہے جس کا کوئی جزو، بیان سے رہ نہ گیا ہو ایک ایک شعر میں رسالے کتابچے کا مضمون سمایا ہوا ہوتا ہے۔

غزل اور خاص کر اردو غزل، ولی دکنی سے گزشتہ زمانے مسلسل طے کرتی ہوئی ہمارے زمانے تک پہنچی بعض مغرب زدہ دماغوں نے اس پر نہایت غیر فلسفیانہ اعتراض تفلسف جتانے کے لئے کئے مگر غزل کی آن بان میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں غزل پر اعتراضات زیادہ ہوئے اسی زمانے میں غزل کے حسن و جمال نے دلوں کو زیادہ مسخر کیا اور اپنے جوہر زیادہ کھل کر دکھائے فانی بدایونی اور جگر مراد آبادی کا زمانہ دراصل غزل پر اعتراض کے شباب کا زمانہ تھا مگر فانی اور جگر کی غزلوں میں متغزلانہ قوت حیات اس قدر زبردست تھی کہ غزل پر آج بھی جوبن پھٹا پڑ رہا ہے اور اعتراضات معلوم نہیں کس گوشے میں مدفون ہو چکے۔

داغ دہلوی کے زمانے سے تقریباً ۱۹۲۵ء تک غزل کا دور دورہ رہا ہے مگر ایسا یاد پڑتا ہے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ غزل کا رنگ پھیکا پڑنے لگا اگرچہ مشاعروں اور ماہناموں میں طرحی غزلوں کا سلسلہ جاری تھا مگر مشاہدے اور تجربے کے لحاظ سے غزل بے دم ہو چکی تھی اس کی وجہ داغ کی کھوکھلی نقالی تھی غزل سے تاثیر بالکل اٹھ چکی تھی کہ فانی ابھرے اور ان کی غزل نے خواص کے دل و دماغ پر قبضہ شروع کر دیا ادھر حسرت نے اعتدال سے غزل کو ہر دل عزیز بنانا شروع کیا مگر جگر مراد آبادی نہ صرف یہ کہ "محی الغزل" ثابت ہوئے بلکہ انہوں نے عوام و خواص میں سے کسی کو تسخیر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔

زمانے کی پرانی بساط الٹی اور غزل کی نوک پلک میں فرق نہ آنا تھا نہ آیا کہ یکایک سیاست کا ایک بے پناہ جھکڑ چلا اسی کے ساتھ اقتصادیات اور معاشیات کے طوفان نے زور پکڑا سائنس کے زلزلوں کے جھٹکے اردو ادبیات کے ایوان کو تہ و بالا کرنے لگے مگر یہ بڑی غنیمت بات تھی کہ یونیورسٹیاں ان آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہیں اور کچھ غزل کے مرتبہ شناس ادبا و شعرا ایسے ابھرے، جنہوں نے غزل کی ہیت کو فلسفیانہ انداز سے محفوظ رکھا اور اسے بگڑنے نہ دیا۔

ذہین صاحب بھی انہی فلسفیان غزل میں سے ایک غزل نواز ہیں ان کی غزل ہر لحاظ سے غزل ہوتی ہے۔ نہایت لطیف جذبات حسین وجمیل الفاظ وعبارت' غزل کی جان سمجھے جاتے ہیں احساس کی تیزی' وجدان کی شفافی' جذبات کا جوش' عشق کی واردات' حسن کے غرور وناز کا شدت سے تاثر آفریں ہونا' آہ ونالے کا زور' مسرت وانبساط کے بگولے' غرض وہ کونسی چیز ہے جو غزل کا قوام ہے اور ذہین صاحب کی غزل میں پورے کمال کے ساتھ دل ودماغ کو نہیں گرماتی۔

ان کے کلام میں تازہ بتازہ تغزل بھی پایا جاتا ہے اور نفسیات بھی' اخلاق کا تاثر بھی موجود ہے اور تصوف کا وجدان بھی' واعظانہ تنبیہہ بھی پائی جاتی ہے اور رندانہ سرمستی بھی' حسن وعشق کی جو لطیف عمیق اور اچھوتی جھلکیاں ان کے افکار میں ملتی ہیں' دلوں کو تڑپادینے کو کافی ہیں ذہین صاحب نے زمانے کے سرووگرم کا عملی تجربہ کیا ہے مگر فکر کو تھکادینے والی قنوطیت اور دلوں کو پاش پاش کردینے والی شکستگی ان کے کلام سے دور ہی رہتی ہے۔

انفرادیت

ذہین صاحب کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ موصوف کے نوے بانوے فیصدی اشعار ایسے ہیں جن کو خالص تغزل کہتے وقت' محض تصوف یا تصوف بحث بھی کہہ سکتے ہیں اور ذہین صاحب کی یہی جامعیت ان کو تمام صوفی اور غزل گو شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے اس وصف میں خواجہ حافظ شیرازی کو چھوڑ کر' اردو فارسی کا کوئی شاعر ان کے پائے پر نہیں آتا۔

ذہین صاحب کے کلام میں تین چیزیں ایسی شدت سے پائی جاتی ہیں جن کی بناء پر انہیں صاحب طرز شاعر کہا جانا چاہئے۔ ان میں پہلی چیز خاص انداز فکر ہے جس کا مرکز خاص ہے دوسرے خاص انداز بیان اور تیسرے جامعیت۔ اردو شاعری میں ذہین صاحب کا مقام غزل کے اعتبار سے نہایت ممتاز ہے زبان صحیح' خیالات نادر اور سنجیدہ' لطیف وشیریں' پھر گھلاوٹ' جو غزل کی زبان کی جان ہے ذہین صاحب کی غزل کا گویا قوام ہے۔

آج ہی نہیں' شاید سو سال تک ایسا غزل گو شاعر پیدا ہو نہ سکے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ

موجودہ دور کے ادیب اور شاعر' اردو شاعری کے مزاج کو چونکہ سمجھنے سے قاصر ہیں اس لئے غزل اور اس کی زبان کو مسلسل نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ سلسلہ اگر بے روک ٹوک جاری رہا تو ممکن ہے سنجیدہ غزل کے آخری سنجیدہ اور صاحب مذہب شاعر' ذہین صاحب ہی شمار کئے جائیں۔

میرے سامنے غزل اور غزل گو شعراء میں ہندوستان کے اردو شعراء بھی ہیں ہندوستانی شعراء میں حضرت میکش اکبر آبادی بھی صاحب مذہب اور صاحب مقام شاعر ہیں میں نے ذہین صاحب کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ علمی دلائل سے مدلل ہے اس سے کسی اردو غزل گو شاعر کی تنقیص یا اہانت مقصود ومنظور نہیں ہے۔

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است

ذہین صاحب کی شاعری کا جائزہ علمی بنیاد پر لیا گیا ہے اپنی عبارت کو اصطلاحات کے بار سے گراں بار نہیں ہونے دیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس تحریر میں ذاتی رائے کا دخل نہیں ہے۔ میں بے دلیل رائے کو جہالت اور خودستائی سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔

میر تقی میر' غالب' ذوق' مومن' داغ' حسرت' فانی اور جگر کا اردو غزل میں اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے جو مقام ہے آج اردو غزل میں ذہین صاحب کا بھی وہی مقام ہے۔

اگر اساتذہ کے دواوین کے مطالعے سے آپ کا جی اکتا جائے تو آپ آیات جمال کو اٹھائیے اور اس کا مطالعہ شروع کردیجئے آپ جلد محسوس فرمالیں گے کہ آپ ایک وحشت انگیز دنیا سے اب ایسے عالم میں آگئے ہیں کہ جہاں۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی محفل آراستہ ہے اور نامعلوم طور پر اس محفل میں کچھ ایسے اسباب جمع ہوگئے ہیں جو آپ کی ذوق نوازی کے رازدار ہیں۔

اس کے کچھ اسباب ہیں۔

آیات جمال میں آپ کو ایک ذوقی لطافت ملے گی۔ غالب کی دماغ شکن مشکل پسندی کا یہاں گزر نہیں' داغ کی متانت شکن بے تکلفی پاس پڑوس میں بھی نہیں بستی۔ فانی کا سوز وگداز جو روح کو ایسے تپائے کہ زندگی دوبھر ہوجائے' برائے نام بھی نہیں ملے گا دل وجگر کو بلاوجہ برمادینے والے الفاظ کے تیرو نشتر وہم وگمان میں بھی نہیں گزرتے زندگی کی جان لیوا

مختلیں اور اس کے نتائج آپ کو پریشان نہیں کر سکتے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را بہ کسے کارے نباشد

آپ سوال کریں گے کہ پھر آیات جمال میں ہے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ چند شعر پڑھیں پھر مولانا ابوالکلام آزاد کی اس رائے کو یاد کریں جو موصوف نے اصغر گونڈوی کے مجموعہ شعر کے متعلق دی ہے۔ آپ کا ذوق اپنے آپ بتادے گا کہ آیات جمال میں کیا ہے۔ اس میں تاثیر ہے۔ خود مستی ہے۔ حسن کی نادیدہ تجلیاں ہیں عشق کی جلوہ نیالودہ نگاہیں ہیں۔ کچھ ایسے سجدے ہیں جو ابھی تک آنکھوں کو ترس رہے ہیں۔ کچھ ایسی آہیں ہیں جو آپ کو سرور ازلی سے متعارف کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ ایسی مستیاں ہیں جن پر عقل رشک کرتی ہے۔ کچھ ایسی دانائیاں ہیں جو جنون بے ادب کو ادب سکھاتی ہیں۔ کچھ شامہ نارسیدہ نکہتیں ہیں، جو رنج وملال کا غبار، آپ کے مصفا دماغ سے دور کر دینے کو آمادہ ہیں۔ آیات جمال میں آپ کو سپردگی کا ایسا عالم ملے گا کہ آپ غیر شعوری طور پر اس میں محو ہو کر اپنے آپ سے گم ہو جائیں گے۔

میں نے آیات جمال میں ایسا ہی کچھ دیکھا ہے۔ ایک دکھا ہوا دل، چوٹ کھایا ہوا وجدان اور شعر سے لگاؤ رکھنے والے ذوق کی ضرورت ہے۔ پھر آپ اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے، جس کی جھلکیاں میں نے آپ کو دکھائی ہیں۔

کسی کلام میں یہ خاصہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر، بعض چیزوں کو اپناتا ہے اور بعض کو ترک کرتا ہے ذہین صاحب نے محبت اور "یکے داں و یکے بیں و یکے گو" کو اپنایا ہے اور جس چیز کو ترک کیا ہے وہ اغلاق وابہام ہے۔ اغلاق وابہام میں شعر کا لطف صرف خواص کے لئے باقی رہ جاتا ہے عوام اس سے بے نصیب ہیں اغلاق وابہام کو بعض مثالوں سے سمجھنا چاہئے اور اس کی اثر انگیزی پر محاکمہ کرنا چاہئے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
ہر چند تیرے رخ سے نظر کامیاب ہے

غالب

جگر مرادآبادی نے اس کے پیچ وخم یوں نکالے ہیں:

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

شعر میں ابہام اب بھی باقی ہے ذہین صاحب نے اس اغلاق کو یوں دور کیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ سب کچھ ہے تو ہی تو اے دوست
یہ اور بات کہ جو کچھ ہے تو، وہی ہم ہیں

ایک نکتہ اس مقام پر خاص طور پر قابل ذکر ہے موجودہ دور میں عاشقانہ خودداری کا بڑا زور ہے حتی کہ آج کل اردو شاعری کا عاشق معشوقیت کا مقام حاصل کر چکا ہے اب بے چارہ معشوق ہے کہ اردو شاعری کے عاشق کے پیچھے تباہ اور خوار وخستہ ہے۔

عاشقانہ خودداری غالب کی ایجاد ہے جگر نے اسے مناسب طور پر ترقی دی مگر مشاعروں کے شعراء نے عرفی کے بھی کان کاٹ لیئے مرزا عبدالقادر بیدل نے فرمایا تھا:

باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اقبال نے اس اغلاق کو یوں دور کیا۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ذہین صاحب کی انفرادیت کا ایک بنیادی جزو' کلام کا اغلاق وابہام سے پاک ہونا بھی ہے اگر کلام 'اغلاق وابہام سے پاک ہوگا اور اہل زبان کی الف وعادت کے مطابق 'انداز بیان سلجھا ہوا ہوگا' تو مشکل سے مشکل مضمون اسی طرح بے تکلف سمجھ میں آجائے گا گویا سامع یا قاری کو یہ مضمون پہلے ہی سے معلوم تھا مثلاً ایک سیدھا سادہ مضمون ہے کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو محبوب کی یاد زیادہ ستاتی ہے غزل کا عامتہ الورود مضمون ہے مگر ذہین صاحب کے انداز بیان نے اس میں ندرت پیدا کی ہے اور اغلاق کا سایہ تک نہیں پڑنے پایا۔

میں چونک پڑتا ہوں رہ رہ کے کنج خلوت میں
یہ دے رہا ہے صدائیں کوئی کہاں سے مجھے

محبوب کا گھڑی گھڑی یاد آنا ایسا ہے گویا محبوب رہ رہ کر آواز دے رہا ہے تمام کلام

یہی حال ہے۔

ذہین صاحب کی انفرادیت اور ان کا صاحب مذہب شاعر ہونا ثابت ہو چکا ہے آیئے اب ان کے معاصر شعراء کے مقابلے میں ان کی انفرادیت کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

ہمارے سامنے اس وقت تین غزل گو شعراء ہیں فانی' حسرت' جگر۔ فانی کے کلام میں سوز و گداز کی بھٹی سلگ رہی ہے اور ذہین صاحب کے ہاں از خود رفتگی اور اس میں لذت کا زور ہے اس لئے مشترکات کلام میں عمومیت نہیں ہے۔ حسرت کے ہاں تغزل کی سادگی اور سماجی رسم و رواج کی جھلکیاں ہیں اسی کے ساتھ 'انداز بیان بھی تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہے مگر ذہین صاحب کے کلام میں عشقیہ جوش و خروش ہے اور حسن مجاز کے ڈانڈے' حقیقت سے ملے ہوئے ہیں اس لئے یہاں بھی موازنے کا سوال کھینچ تان ہی سے پیدا ہوتا ہے البتہ جناب جگر کے کلام میں عاشقانہ واردات' حسن کا اثر و تاثر شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ تازہ گوئی اور خوش آہنگی بھی جگر کے کلام پر پھبتی پڑتی ہے لہٰذا بعض اشعار ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے اردو کے دو مایہ ناز شاعروں کا مقام دریافت ہوتا ہے جگر صاحب کا شعر ہے۔

بھلانا ہمارا مبارک مبارک
مگر شرط یہ ہے نہ یاد آیئے گا

اگرچہ اس شعر کا ماخذ بظاہر یہ ہندی دوھا معلوم ہوتا ہے۔

بانہہ چھڑائے جات ہو نربل جان کے موئے
ہردے میں سے جایئے تو مرد بدوں گی توئے

حسرت نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ذہین صاحب کا ایک شعر ہے۔

جس قدر ان کو بھولنا چاہا
یاد آئے بہت ہی یاد آئے

اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ ہندی دوھے کا مضمون تمام شعروں میں نہایت موثر اور اچھوتا

ہے تاہم حسرت اور جگر کے مقابلے میں ذہین صاحب کے شعر کی کیفیت' اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے یہاں اپنی اپنی پسند کا سوال نہیں ہے یہ عامیانہ اصول ہے اگر اپنی پسند کے ساتھ کوئی علمی دلیل ہے تو وہ پسند معیاری پسند ہوگی۔

جگر غزل حاضرہ اور تغزل موجودہ کا بانی ہے جگر کی ایک مسلسل غزل ہے جو شعلہ طور میں ہے اس کا مطلع اور بعض اشعار یہ ہیں۔

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے
حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے
اف وہ روئے تابناک و چشم تر میرے لئے
ہائے وہ زلف پریشاں تا کمر میرے لئے
ہائے وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
آہ وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
اس نگاہ ناز کی وہ ہلکی ہلکی جنبشیں
معنی بے لفظ و شرح مختصر میرے لئے
وہ رخ رنگیں پہ انوار محبت زرد زرد
وہ لب نازک پہ طوفان شرر میرے لئے
ان کا کہنا یاد ہے بانہوں میں بانہیں ڈال کر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

اتفاق سے ذہین صاحب کے مجموعے میں ایک مسلسل غزل ہے جس کے بعض شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

تمہیں بھی مری یاد آتی تو ہوگی
محبت تمہیں بھی ستاتی تو ہوگی
مجھے خواب میں تم نے دیکھا تو ہوگا
تمہیں بھی کبھی نیند آتی تو ہوگی
تمہارا بھی کیا حال میرا سا ہوگا
محبت کہیں راس آتی تو ہوگی

کبھی دل کا چاہا بھی ہوتا تو ہوگا
کبھی دل کی حسرت بر آتی تو ہوگی
جہاں مسکراتے تھے تم چاندنی میں
وہاں چاندنی مسکراتی تو ہوگی
جدائی کے احساس کی ظلمتوں میں
کہیں شمع سی جھلملاتی تو ہوگی

سب سے پہلے اس غزل کی ردیف کے الفاظ پر غور کرنا چاہئے جس میں کہیں تمنا وشک کی جھلک ہے تو کہیں تمنا واستقبال کی "یاد آتی تو ہوگی" یعنی یاد آنے کا امکان یا تمنا کے ساتھ شک کا اظہار بھی ہے یقین شک کے پردے میں بیان کرنا بلیغ انداز بیان ہے علم معانی کے دقائق میں ایک دقیق نکتہ ہے تمام ردیفوں کو اسی پر قیاس کرنا چاہئے۔

تمہیں بھی مری یاد آتی تو ہوگی

علم اقلیدس میں بعض اشکال کا عکس بھی ثابت ہے اسی طرح منطق میں بعض قضایا کا عکس بھی پایا جاتا ہے۔

مرقومہ مصرع میں بھی کلمہ اشتراک ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے رات دن تمہاری یاد آتی رہتی ہے اسی لئے یقیناً میری یاد بھی تم کو آتی رہتی ہوگی "محبت تمہیں بھی ستاتی تو ہوگی" کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو مستقل ستائے جارہی ہے ممکن ہے کہ تمہارا حال بھی یہی ہو۔ انداز بیان کا کمال یہ ہے کہ عاشق معشوق سے اس کی حالت اور کیفیت مشتبہ انداز میں معلوم کرتا ہے اور درپردہ اپنا حال اور اپنی کیفیت بیان کرتا ہے اس لئے شبہ کی جگہ یقین لے لیتا ہے۔

جگر نے اپنی غزل میں نہایت دقیق اور لطیف واردات کا بیان کیا ہے مگر ذمین صاحب نے جن جن احساسات اور جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے نفسیاتی ہونے کی وجہ سے بیحد موثر ہے۔

محبوب کا یاد آنا، محبت کا ستانا، ایک نفسیاتی مطالعہ ہے زمانہ ماضی کا حافظے میں اس طرح ابھر آنا کہ۔

جہاں مسکراتے تھے تم چاندنی میں
وہاں چاندنی مسکراتی تو ہوگی

ماضی حال بن جاتا ہے جگر صاحب نے حضوری محبوب کی کیفیت بیان کی ہے ذمین صاحب نے فراق کی عکاسی کی ہے اور اس انداز سے یہ عکاسی کی ہے کہ کچھ نہ کہنے کے باوجود اپنا حال رتی سے رائی تک کہہ دیا ہے۔

مجھے خواب میں تم نے دیکھا تو ہوگا
تمہیں بھی کبھی نیند آتی تو ہوگی

شعر کا ماحصل یہ ہے کہ میں جب سوتا ہوں تو خواب میں تم ہی کو دیکھتا ہوں اور لطف یہ کہ عاشق اپنی بے خوابی بھی جتا گیا اس کی شرح یہ ہے کہ اے محبوب اول تو میں تیری یاد میں سو ہی نہیں سکتا اور بالفرض حسب تقاضائے بشریت جب کبھی سوتا ہوں تو خواب میں تمہیں کو دیکھتا ہوں "تمہیں بھی کبھی نیند آتی تو ہوگی" جیسے کہ کبھی کبھی مجھے نیند آجاتی ہے "مجھے خواب میں تم نے دیکھا تو ہوگا" جیسے میں خواب میں تم کو دیکھتا رہتا ہوں اور اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

تمہارا بھی کیا حال میرا سا ہوگا
محبت کبھی راس آتی تو ہوگی

کیا تمہارا حال میرے حال کی طرح ہوگا؟ نہیں نہیں! تمہارا حال میرا سا نہیں ہو سکتا "استفہام انکاری بالا قرار" عاشق کو اپنے حال خراب کا علم صحیح ہے اس لئے محبوب کے لئے اپنا سا حال پسند نہیں کرتا اور اسی اندیشے کے پیش نظر کہتا ہے کہ مجھے تو محبت راس نہیں آئی مگر اتنی بڑی دنیا میں کہیں نہ کہیں محبت کسی کو راس آتی تو ہوگی اور اے محبوب! خدا کرے وہ تم ہی ہو جن کو محبت راس آتی ہے تاکہ تمہارا حال میرے حال کی طرح خراب نہ ہو۔

ذمین صاحب کی اس مسلسل غزل کی یہ سرسری شرح ہے اس میں شک نہیں کہ جگر کی غزل میں بعض کیفیات نہایت لطیف اور انوکھی ہیں اس لئے تمام اشعار میں بعض شعر بھی ممتاز ہیں خصوصاً یہ شعر۔

وہ رخ رنگیں پہ انوار محبت زرد زرد
وہ لب نازک پہ طوفان شرر میرے لئے

ذہین صاحب کی غزل مسلسل کا ہر شعر ایک نئی کیفیت رکھتا ہے اور چونکہ وہ کیفیت ایسی ہے جو حسن وعشق کے تعلق باہمی میں پیش آتی رہتی ہے اس لئے اس میں صداقت کے ساتھ تاثیر بھی ہے انکا ایک شعر ہے۔

عشق میں آرزو سے باز آئے
کون یہ بات دل کو سمجھائے

نظیری نے آج سے تین سو برس پہلے کہا تھا۔

ہوائے وصل کسے میکند کہ بوالہوس ست
در اں دلے کہ محبت بود تمنا نیست

نظیری کا فلسفہ' فلسفہ وعظ ہے یہ ایک مدلل حکیمانہ انداز بیان ہے اور چونکہ غزل میں یہ شعر واقع ہوا ہے اس لئے ایسے جید حکیمانہ استدلال کی وجہ سے قابل داد ہے بہرحال چونکہ دوسروں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے اسلئے اس کی شعریت غزل کے نتیجہ فکر تک محدود ہے۔

ذہین صاحب کا شعر تجریداً اپنے آپ ہی سے خطاب ہے اس لئے بد ہمہ وجوہ شعر ہے اور شعر کی تعریف کا بہترین مصداق ہے شاعر یا مخاطب' دل کا غیر نہیں ہے عاشق نے اپنے دل کو اپنی ہی مانند ایسا دوسرا شخص قرار دے لیا ہے یہی تجرید کا فلسفیانہ مفہوم ہے ماحصل یہ ہے کہ عشق میں عشق ہی مراد' عشق ہی تمنا ہے یہ بات دل کو کون سمجھائے؟

"کون" کے لفظ نے جو انشائی حالت پیدا کردی ہے اس کی بلاغت نظیری کی حالت خبری کے مقابلے میں نمایاں تر ہے۔

جگر مراد آبادی کا ایک شعر ایسا ہے کہ اردو فارسی میں ایسے شعر بہت ہی کم کہے گئے ہوں گے۔

تو وہ بہار تازہ دنیائے رنگ وبو کی
اک بار جس نے دیکھا تا حشر آرزو کی

ذہین صاحب نے بھی ایک شعر عجیب کہا ہے اور وہ یہ ہے۔

دیکھا نہ تھا تو آرزوئے دید تھی مجھے
کیا آرزوئے دید تجھے دیکھ کر نہیں

دونوں شعروں میں ایک دقیق فرق ہے جگر کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب' حسن کے اس درجہ کمال پر واقع ہوا ہے کہ اگر اسے کوئی ایک بار دیکھ لئے اور پھر کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو تو وہ دنیا سے یہ آرزوئے دید ساتھ ہی لیکر جائے گا اس کے برخلاف: ذہین صاحب کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب حسن کے اس کمال عروج پر فائز ہے کہ جب دیکھنے والا اس کے نظارہ حسن میں محو ہوتا ہے عین اس وقت بھی اس کو احساس ہوتا ہے کہ میں نے ابھی اس حسین تجلی کو دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ دیکھنے کے زمانے میں ہی اسکی آرزوئے دید میں اور شدت ہوتی چلی جاتی ہے اور آرزو بڑھتی چلی جاتی ہے۔

عرفی نے اسکے قریب کہا ہے۔

از جلوہ بیارام دے کایں ہمہ خوبی
در حوصلہ دیدہ بیک بار نہ گنجد

عرفی کے مقابلے میں ذہین صاحب کا یہ کہنا۔

دیکھا نہ تھا تو آرزوئے دید تھی مجھے

ایک ایسا ٹکڑا ہے جو مضمون یا احساس کے نقطے کو بدلتا ہے اور دونوں شعروں کی حدیں الگ الگ ہو جاتی ہیں ذہین صاحب کے کلام میں معاصرین اور متقدمین سے موازنے کا کافی مواد ہے نمونے کے طور پر چند سرسری مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے اس سے مقصود ذہین صاحب کی برتری کسی متقدم یا معاصر شاعر پر نہیں ہے بلکہ ذہین صاحب کی انفرادیت کے اسباب کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

حسن بیان

حسن بیان ایک ملکہ' فطری ہے (جس کا عرفان' مذاق سلیم کے بغیر ناممکن ہے) جو ذہین صاحب کے کلام میں شدت ظہور سے الفاظ وعبارت پر چھایا ہوا ہے انکے کلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تشبیہات اور استعارے ایسے ہیں جیسے آٹے میں نمک۔ فلاسفہ' بلاغت کا فیصلہ ہے کہ تشبیہات واستعارات اکثر کلام سے تاثیر کو فنا کردیتے ہیں اس کی وجہ

یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات میں دماغ اور عقل کا حصہ ہے دل کی قسمت نہیں، عقل وجہ شبہ اور وجہ جامع کے مسائل میں مبتلا ہو جاتی ہے شعر کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تاثیر ہے اگر شعر میں تاثیر نہیں تو صرف کلام موزوں ہے اس پر شعر کا اطلاق بمشکل بھی محال ہے۔

جگر مراد آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

کارگران شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے یہ شعر میں پھر کیوں اثر نہیں

واقعہ یہ ہے کہ ذ مین صاحب کا کلام تاثیر کا ایک طلسم ہے، اثر انگیزی کا طوفان ہے تپش آفرینی اور اضطراب کوشی کا ایک زلزلہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں اکثر مجاز اور حقیقت ایک نقطے پر جمع ہو جاتے ہیں اور شعر کا صحیح مذاق رکھنے والے ہی اس کلام سے لذت پاتے ہیں اور چوٹ کھائے ہوئے دل تڑپنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اہل دل حضرات بھی اپنی روحانی اور فکری کیفیات کے تطابق سے جھوم جھوم اٹھتے ہیں اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔

روز مرہ کی گفتگو میں ہم غیر شعوری طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ جو لفظ ہماری زبان سے نکلے وہ یہی نہیں کہ ہمارے منشا کی امانت کو دیانت کے ساتھ ادا کردے بلکہ وہ خوبصورت اور شائستہ ہو اور سامع کے ذہن وادراک سے بھی اسکا گہرا تعلق ہو اگر الفاظ میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں ہوگا تو سامع کا تو ذکر ہی کیا ہے خود ہم میں بھی ایک کھٹک سی پیدا ہو جائے گی اور ہم اس احساس کو کم نہ کر سکیں گے کہ بات نہ بنی، کوئی کسر ضرور باقی رہ گئی۔

پہلی خصوصیت

ذ مین صاحب الفاظ کا استعمال معانی والفاظ کے مزاج کی مطابقت سے کرتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب پر پوری توجہ دیتے ہیں۔

دوسری خصوصیت

فصاحت سے مراد یہ ہے کہ کلام میں جو الفاظ استعمال کیے جائیں ان میں سے ہر لفظ بجائے خود ایسا ہو جس کے تلفظ میں زبان کو وقت نہ ہو بلکہ متکلم کی زبان اور مخاطب کے

سامعہ پر ڈھلکتا چلا جائے فصاحت خوش آہنگی بے تکلفی سلاست ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں فصاحت کی تعریف فلسفیان معانی نے جو کچھ کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ثقالت سے پاک ہو اس کی ادائگی سہل ہو قواعد صرف کے مطابق ہو۔

لفظ حقیقت میں معانی کا قائم مقام ہے فلسفہ لسان کے علماء نے اس پر بڑی اچھی بحثیں کی ہیں، جو لسانی اعتبار سے اپنانے کے قابل ہیں مگر اس اپنانے میں ہمیں صرف اصول کو اپنانا پڑے گا اردو زبان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے یعنی اردو زبان کے لسانی فلسفے میں اسکو اس احتیاط سے اختیار کرنا چاہئے کہ ہماری زبان کی انفرادیت کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

فصاحت کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے ہر لفظ گویا ایک پھول ہے جو ایک خاص خوشبو کا قائم مقام ہے ہر پھول کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ایک خاص ہیئت رکھتا ہے مثلاً گلاب کا پھول، موتیا، رائے بیل، چمپا، جوہی، مولسری وغیرہ کے پھول، یہ تمام پھول اپنی ساخت ہیئت اور خوشبو کے لحاظ سے ایک جداگانہ خصوصیت کے مالک ہیں۔ برخلاف اس کے دھتورے کا پھول یا کٹیلی کا پھول، اس قسم کے پھول ہیں جو اپنی ہیئت اور بو میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ مگر پسندیدہ خوشبو والوں سے ممتاز ہیں۔ چنانچہ ہر ایسا لفظ جس کے تمام حروف جن کا وہ لفظ مجموعہ ہے ایک پسندیدہ خوشبو کا قائم مقام ہے۔ اس کے حروف کے تمام مخارج پھول کی پنکھڑیوں سے مشابہ ہیں۔ اب ایسے الفاظ جو مسلسل آئیں ان کو بھی مقررہ لفظ کی طرح بلحاظ مخارج اور بہ اعتبار ترکیب صرفی ایسا ہی ہونا چاہئے ایسے الفاظ یا کلمات سے جو عبارت مرتب ہوگی وہ فصیح ہوگی اور اس عبارت کے عطر مجموعہ کی مثال کو گلدستہ سمجھنا چاہئے جس میں گلاب، بیلا، چنبیلی، موتیا وغیرہ کے پھول سجائے گئے ہوں آنکھ اس نظارے سے لطف حاصل کرے گی اور ان پھولوں کی مخلوط خوشبو ایک نئی مرکب خوشبو کو جنم دے گی یہی عطر مجموعہ کی بنیاد ہے۔

اس اصول کی بنا پر ہر فصیح لفظ یا کلمہ، ایک مطبوع و مرغوب پھول ہے اس کے ساتھ، جو الفاظ لائے جائیں وہ باہم مناسبت رکھتے ہیں ایسے الفاظ کے ساتھ وہ الفاظ نہ لائے جائیں، جن کا تلفظ زبان پر گراں گزرے اور سننے والا ان سے کراہت کرے اگر ایسے الفاظ کے ساتھ کوئی غیر فصیح لفظ آ گیا تو گویا گلدستہ میں گلاب، چمپا، موتیا وغیرہ کے ساتھ دھتورے کا

BZSTRFT

پھول بھی باندھ دیا گیا ہے۔

ذہین صاحب کے کلام میں جتنے الفاظ ہوتے ہیں' وہ اپنے گرد و پیش کے الفاظ سے اعلیٰ درجے کی مناسبت رکھتے ہیں مثلاً۔

تمہیں بھی مری یاد آتی تو ہوگی
محبت تمہیں بھی ستاتی تو ہوگی

اس عبارت میں ہر لفظ زبان پر ڈھلکتا چلا جاتا ہے اسی پر پورے مصرع اور پھر پورے شعر کو قیاس کرنا چاہیے' آئندہ عنوان میں جتنے شعر نقل کیے جائیں گے ان میں فصاحت بھی شامل ہوگی۔

بندش کی چستی

جملوں کا در و بست اور ترتیب جملے میں مسند و مسندالیہ کا ذکر جتنا روزمرہ کے مطابق ہوگا اتنا ہی کلام میں حسن بھی زیادہ ہوگا اور یہ بات اس وقت تک نصیب نہیں ہوگی جس وقت تک عبارت کی ترکیب چست نہ ہو' یعنی اگر عبارت میں ڈھیلاپن اور تراخی ہوگی تو زبان اس عبارت سے لذت حاصل نہیں کر سکے گی اور سامعہ اس سے کراہت ہی محسوس کرے گی۔

ذہین صاحب اپنے شعر کو چست بنانے پر کافی توجہ کرتے ہیں بڑی بڑی نظمیں لکھتے ہیں۔ سیر حاصل غزلیں کہتے ہیں مگر تراخی یا ڈھیلاپن ان کے کلام میں شاذ و نادر ہی واقع ہوتا ہے۔ موصوف کا ہر شعر بندش کی چستی کا اردو میں بہت اچھا نمونہ ہے جداگانہ مثالیں لکھنا اضاعت وقت ہے دوسری مثالوں میں بندش کی چستی اور عبارت کے در و بست کو شامل سمجھنا چاہیے۔

حسن ترکیب

دو لفظوں یا دو سے زیادہ لفظوں کو ملا کر ایک مرکب لفظ بنالینے کا نام ترکیب ہے۔ غالب' فانی اور اصغر نے سینکڑوں نئی تراکیب استعمال کی ہیں غالب کے ہاں' جہاں خوش نما ترکیبوں کی کثرت ہے وہاں بعض نامانوس ترکیبیں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند (وغیرہ) مگر فانی اور اصغر کے کلام میں ناپسندیدہ ترکیبیں بہت کم ہیں۔

ذہین صاحب کے کلام میں نئی نئی تراکیب پائی جاتی ہیں مگر جتنی ہیں وہ نہایت پسندیدہ ہیں مثلاً

قابل صد صور برق' ہیولائے جمال
تو نے اس پر نہ کیا غور کبھی دل کیا ہے
حسن آئینہ طلب اور حیا مجلہ پسند
ان سے خلوت میں یہ پوچھیں گے کہ محفل کیا ہے
شرح کم ہمتی' اہل زمانہ' آساں
کچھ ہمیں خوب سمجھتے ہیں کہ مشکل کیا ہے

قابل صد صور برق' ہیولائے جمال' آئینہ طلب' مجلہ پسند' شرح کم ہمتی' اہل زمانہ' یہ تمام تراکیب نئی ہیں مگر ان کی دل کشی اور صوتی نغمگی نہایت پسندیدہ ہے کچھ نمونہ اور ملاحظہ فرمایئے۔

قبلہ وکعبہ الم ہیں ہم
خود الف لام میم ہم ہیں ہم
ہم پہ قرآن عشق اترا ہے
مرسلان خدائے غم ہیں ہم

حسن وحدت ہے یہی جلوہ کہ وحدت حسن
کثرت نام ونشان دگراں ہے عالم
خلق سودا زدۂ دیر وحرم ہے لیکن
ہے کوئی ان میں جسے میں ترا دیوانہ کہوں
دل اپنا طور منظر وموسیٰ نگاہ ہے
کہتے ہیں جس کو جلوہ نگر جلوہ گاہ ہے

ٹھہر سکا نہ حرم میں دل رمیدہ دیر
یہاں خدا کے تصور میں بہت گری سی ہے

برجستگی یا بے تکلفی

اس کو آمد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے شعر کو اس طرح ترتیب دینا کہ سننے یا پڑھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ کلام بے ساختہ اور بلا تکلف ہے اس میں تصنع کی بو باس تک نہیں ہے یہ مقام شاعر کو بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے ذمین صاحب کے کلام کو جہاں سے دیکھئے اس میں ایک قسم کی برجستگی دیکھنے میں آئے گی مثلاً۔

جو چیز ڈھونڈتا تھا وہی مل گئی مجھے
تم کیا ملے جہان سے فرصت ملی مجھے
آزاد نگاہی بھی تو آخر کوئی شے ہے
کیا فرض ہے بت خانے کو بتخانہ سمجھنا
تو نے دیوانہ بنایا تو میں دیوانہ بنا
اب مجھے ہوش کی دنیا میں تماشا نہ بنا
ترا جمال یہی کہ نظر ہے اپنی جمیل
ترا شباب یہی کہ شباب ہے اپنا
کھوئی ہوئی سی ہر شے معلوم ہو رہی ہے
کیا چیز بھول آیا میں تیری انجمن میں
مجھ سا کوئی اسیر غم جستجو نہ ہو
اب یہ تلاش ہے کہ کہیں مجھ میں تو نہ ہو
تن دیا من دیا دھن دیا فن دیا
تو نے جو کچھ دیا دوست! دشمن دیا

روز مرہ اور محاورہ

برجستگی اور بے تکلفی کی طرف انسان کا ذہن اس وقت منتقل ہوتا ہے جب وہ وزن اور ردیف قافیے کی وقتوں کے ساتھ کلام میں روز مرہ اور محاورے کے حسن کو دیکھتا ہے۔ ذمین صاحب کے کلام کی پسندیدگی کا ایک جز ان کے کلام میں روز مرہ کی پابندی بھی ہے وہ محاورات کو محاورات کے نرے استعمال کے لحاظ سے کلام میں نہیں لاتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں

کہ کیا یہ مضمون اپنے مزاج کے لحاظ سے فلاں محاورے کا تقاضا کرتا ہے۔

محاورے کے استعمال کا فلسفیانہ راز یہ ہے کہ محاورے میں ایک کنائی حیثیت بھی پائی جاتی ہے جو ادائے مطلب میں نہایت مفید ہے بحث تفصیل طلب ہے۔ بہر حال ذمین صاحب کے روز مرہ اور محاورے کا نمونہ ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے۔

وہ بدلکر بھیس میرے سامنے آتے رہے
ایک ہی تصویر ہر صورت میں دکھلاتے رہے
فرش گل آیا نظر اہل جنوں کو خار زار
وہ محبت کی نظر پر پھول برساتے رہے
حاصل ترک خورونوش بلانوشان عشق
رات دن پیتے رہے آنسو تو غم کھاتے رہے
یہ ستم ہے یا کرم ہے کیا نہیں کیا ہے کہ آپ
درد دل دیتے رہے تسکین فرماتے رہے
عشق ہے وارفتگی میں عین استغنائے حسن
ہاتھ وہ آئے ہیں یا ہم ہاتھ سے جاتے رہے
بھول کر جس نے نہ ہمکو یاد فرمایا ذمین
عمر بھر اس بے وفا کے گیت ہم گاتے رہے

○

شمع کی فطرت میں پوشیدہ شعلہ کس نے دیکھا ہے
اپنی آگ میں آپ ہی جلنا سیکھا ہے پروانوں سے

○

وہ آئیں گے وہ آتے ہیں وہ آنے کو ہیں وہ آئے
تصور کو وہ بہلائیں تصور ہم کو بہلائے
وہ چمکا چاند' چھٹکی چاندنی' تارے نکلے آئے
وہ کیا آئے' زمیں پر آسماں نے پھول برسائے
اچانک قلب دھڑکا' سانس پھولی' پاؤں تھرائے
وہ ہم سے کچھ قریب آئے کہ ہم ان کے قریب آئے

نظر ملا نہ سکے عاشقوں سے اہل خرد
رہ جنوں سے دبے پاؤں آگہی گزری
تمہاری یاد تھی یادش بخیر دل کے ساتھ
مگر یہ چیز تو مدت ہوئی گئی گزری

اسلوب بیان

ذہین صاحب کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ معمولی انداز میں' ایسی شگفتہ ندرت پیدا کرتے ہیں جس سے وجدان جھوم اٹھتا ہے اور غالب کا سا اغلاق بھی پیدا نہیں ہوتا مثلاً

کیا نہ دیکھا یہ کہو' یہ نہ کہو کیا دیکھا
ہم نے جو کچھ بھی کسی بزم میں دیکھا' دیکھا

یہ انداز بیان' روزمرہ کی گفتگو کے عین مطابق ہونے کے علاوہ بجائے خود نہایت نادر اور الف وعادت کے مطابق ہے اس کا مقابلہ غالب کے اس انداز بیان سے کرنا چاہئے۔

قطرہ مے' بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے' سراسر رشتہ' گوہر ہوا

غالب' اردو میں انداز بیان کے تنوع کا موجد ہے۔ فانی نے اسے ترقی دی' جوش ملیح آبادی نے اسے نکھارا مگر ان میں سے ہر بزرگ نے روزمرہ کے انداز بیان سے ہٹ کر نئے اسالیب بیان اختراع کئے ہیں۔ ذہین صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے سپاٹ انداز میں نئے نئے ایسے اسالیب پیدا کئے جو جتنے نادر اور حسین ہیں اتنے ہی سپاٹ انداز بیان سے قریب ہیں سپاٹ انداز بیان میں نئی راہیں پیدا کرنا اسلوب بیان میں گہرے انہماک سے تعلق رکھتا ہے مثلاً

تیرے در کے فقیر ہیں ہم لوگ
کیا امیر وکبیر ہیں ہم لوگ
دل میں رکھتے ہیں چاند سی صورت
کیا ہی روشن ضمیر ہیں ہم لوگ

"روشن ضمیری" کے ثبوت کے لئے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے بالکل فطری ہے

اور سپاٹ انداز بیان سے ماخوذ ہے۔

معنوی خصوصیات

یہاں تک جن خصوصیات کلام کا ذکر کیا گیا ہے وہ لفظ واسالیب سے متعلق تھا اب معنوی خصوصیات پر بات کی جائے۔ ذہین صاحب جس شاعریا شخصیت سے عبارت ہیں اس کے صحیح مطالعے کا یہی مقام ہے۔

عربوں نے اپنی علمی ترقی کے دور میں ضروریات حیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے معمور نہ کردیا ہو خصوصاً ادبیات کے باب میں عربوں نے جو غوروفکر کے نتائج چھوڑے ہیں وہ ہماری آج کی ضروریات کے بالکل مطابق ہیں اور چونکہ یہ نتائج غور وفکر' انسانی ساخت اور انسانی فطرت کے اقتضا کے مطابق ہیں اس لئے آئندہ بھی ان کی افادیت غیر مشتبہ ہے اسٹائل یا انداز بیان کے متعلق آج ہمارا ذہین طبقہ کیسے کیسے دماغی ڈنڈ پیل رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ عربوں نے اس معمے کو دو چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کیا ہے۔

ما قال وکیف قال یعنی کیا کہا ہے اور کس طرح کہا ہے؟

خواہ وہ کسی زبان کی بحث ہو اس کے معانی کو اسی معیار پر جانچا جائے گا اسی میں اردو زبان بھی داخل ہے منقولہ بالا بیان میں "کیا کہا ہے" سے مراد وہ خیال وہ احساس یا وہ تجربہ مراد ہے جس کے کہنے کی ضرورت لاحق ہے دوسرے لفظوں میں اسے مضمون یا معنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

(ا) اسلوب بیان دراصل معانی آفرینی کی ایک قسم ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل زبان روزمرہ کی بات چیت میں ایک خاص انداز بیان کے عادی ہوتے ہیں چونکہ ہر وقت کی بات چیت میں انداز بیان ایسا ہوتا ہے جو مطلب کو بلاتوقف سمجھنے سمجھانے کے لئے' مفید ہوتا ہے اس لئے شاعری میں ایسا انداز بیان نہایت مقبول ہوتا ہے' جو اہل زبان کی الف وعادت کے مطابق ہو۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ ہر وقت کی بات چیت میں ایک سپاٹ قسم کا انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے اس میں ندرت اور شعریت کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا اسی انداز بیان میں اگر ندرت

پیدا کرلی جائے تو پھر وہ تسخیر کا عمل بن جاتی ہے۔

ذہین صاحب کا ہر شعر، خواہ وہ تغزل سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور موضوع سے ایک ایسا مفرد مضمون ہوتا ہے کہ جس کی ترتیب پر وہ نہایت محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں تاکہ واقعہ یا مضمون کا کوئی جزو بیان سے نہ رہ جائے ان کا شعر ہے۔

اک التفات مسلسل ہے مدعائے جنوں
کرم نہیں تو ستم ہی وہ بار بار کریں

یہ ایک ایسا مفرد مضمون ہے جو دو مصرعوں میں مشکل سے سما سکتا ہے جنون، مجنون کی جگہ استعمال ہوا ہے صفت بول کر موصوف مراد لیا گیا ہے دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جنون کے لئے التفات ثابت کرکے جنون کو ایک ذی روح سے استعارہ کیا ہے۔

کہنا صرف اس قدر ہے کہ عاشق ہر حالت میں محبوب کا التفات چاہتا ہے صرف اس مضمون کی توضیح کی غرض سے اس طرح پھیلا کر بیان کیا ہے کہ وہ ایک مستقل مضمون بن گیا اور مضمون کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس میں بجائے خود ایسی وسعت پیدا ہوگئی کہ اگر اس کو ایک خاص ترتیب اور تسلسل سے نہ بیان کیا جائے تو اس کا سمجھنا متعذر ہو جائے گا۔

علم معانی ایک ایسا علم ہے، جس میں قرائن سے بحث کی جاتی ہے ذہین صاحب کے مرقومہ بالا شعر میں اصل واقعے کو نہایت تفصیل سے مسلسل بیان کیا گیا ہے یہ مضمون کے حسن ترتیب ہی کی خصوصیت ہے کہ شعر سنتے ہی یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔

(۳) معنی آفرینی یا مضمون آفرینی ایک ایسا لفظ ہے جو ہر تعلیم یافتہ کی زبان سے سننے میں آتا رہا ہے مگر ایسے ادیب یا شاعر کم ہیں جو معنی آفرینی کی ماہیت اور اسکے اجزا سے واقف ہوں۔

معنی آفرینی

فلسفیان ادب نے نئی تشبیہ، نادر اور لطیف استعارے، اچھوتے انداز بیان، روزمرہ اور محاورے کے دلکش انداز کو معنی آفرینی کے اجزائے ترکیبی سے تعبیر کیا ہے جو کسی نئے خیال یا نئے احساس کے ضمن میں بیان کئے جاتے ہیں معنی آفرینی کی اس ماہیت اور تصور

کے لحاظ سے ذہین صاحب کا کلام ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تشبیہ کی افراط اور مثالیہ کے زور نے شاعری کو اپنے مرتبے سے گرا دیا تھا داغ دہلوی نے اس کو کم کیا، حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی نے اس کو اعتدال بخشا مگر جوش ملیح آبادی نے اس کو اپنایا اور اس میں حسن پیدا کیا۔ ذہین صاحب فلسفہ تشبیہ کا اچھا شعور رکھتے ہیں وہ تشبیہ کی ضرورت اور مقام سے آگاہ ہیں ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ بہرحال معانی آفرینی کی لطیف اور نادر مثالیں ان کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً

بہت دور ہیں اصلیت سے فسانے
بڑا فاصلہ ہے دلوں سے زبان تک

دعا لب پہ آتی ہے دل سے نکل کر
زمیں سے پہنچتی ہے بات آسماں تک

وہ بہاریں جو ترے ساتھ مجھے دیکھ گئیں
کیا کہیں گی اگر آکر مجھے تنہا دیکھا

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

نظام منع تماشائے حسن کے صدقے
وہ آئے بھی تو مری بیخودی کے پردے میں

تجھ سا کوئی نہیں ہے تو یہ تیرے سامنے
اترا رہا ہے آئینہ پھر کیا لئے ہوئے

بہت دنوں سے در دل پہ پاسباں ہیں ہم
زہے نصیب جہاں آپ ہیں وہاں ہیں ہم

پھول کو میری آنکھیں ترستی رہیں
پھول کو بے طلب تونے گلشن دیا

علم بیان ہمارے ادب کا نہایت اہم موضوع ہے۔ اس پر بڑے بڑے لوگوں نے کلام کیا ہے امام غزالی، امام فخرالدین رازی جیسے اکابر نے اس پر بحث کی ہے ان بحثوں میں

تشبیہ کے جو اسرار اور لطافتیں منکشف ہوئی ہیں وہ نہایت قیمتی ہیں ہمارے زمانے میں تشبیہ اور استعارات کی حالت نادان دوستوں کے ہاتھوں بیحد خراب ہے۔ بعض ماہناموں کے ایڈیٹر جو صلاحیت عقل سے بہرہ یاب ضرور ہیں لیکن علوم ادبیہ میں مطلقاً اپنے اس عدم علم کا اعلان اپنی تنقیدوں میں نہایت بلند آہنگی سے کرتے رہتے ہیں۔

ذہین صاحب کے کلام میں تشبیہات و استعارات کا استعمال اسقدر اعتدال سے پایا جاتا ہے جو حسن کلام کا معاون ہے ذہین صاحب کے کلام میں باوجودیکہ ہر قسم کی تشبیہات ندرت و لطافت کے ساتھ ملتی ہیں استعارات کا استعمال بھی نہایت طرفگی اور جدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ کلام سے ہر قسم کی تشبیہات اخذ کی جاتیں اور نمونے کے طور پر ہر تشبیہ اور استعارے کی ضرورت پر روشنی ڈالی جاتی مگر اس صورت میں یہ چند سطور ایک ضخیم مجلّہ میں تبدیل ہو جاتیں اور پھر اس قلت وقت کا کیا علاج کہ دیوان کی طباعت شروع ہو چکی اور میں ذہین صاحب کے کلام پر غور کر رہا ہوں مجبوراً اجمال سے کام لینا پڑ رہا ہے اب ایسے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں تشبیہات اور استعارات کا حسن چھپائے نہیں چھپتا۔

نگاہوں کی زبانی دل کے پیغام
برابر آرہے ہیں جارہے ہیں

اب ان کی یاد بھی آتی ہے ایسے
کہ جیسے ہم انہیں یاد آرہے ہیں

عرق آلود ہیں رخسار گل گوں
کہ پھولوں کو پسینے آرہے ہیں

○

وہ آئینہ کبھی منہ دیکھتے تھے جس میں تم اپنا
لئے بیٹھا ہے آغوش تہی میں عکس گم اپنا

○

چٹک گلوں کی صدائے شکست دل سے ملی
مگر گلوں کا دل خوں شدہ سے خوں نہ ملا

○

دم سرد آہ گرم وچشم تر سے دل نہ بجھ جائے
یہ شمع زیر داماں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

حسن و عشق

اردو شاعری سے حسن و عشق کا تعلق چولی دامن جیسا ہے۔ اس لئے ان دونوں موضوعات کے متعلق اشارۃً چند سطور لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حسن کی تعریف یہ ہے کہ وجدان پر محسوس یا معقول کے تاثر کا ردعمل جب محسوس میں ظاہر ہو اگر وہ نفس ناطقہ کی ضرورت کے مطابق ہو تو "حسن" ہے۔ شعر ہو یا تصویر' تعمیر ہو یا نغمہ' لباس ہو یا اطعمہ' وجدان کے تاثر کا ردعمل ہے اور محسوس میں ہے اس لئے حسن ہی کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ نفس ناطقہ کی ضرورت کی شرط کا اضافہ اس لئے ہے کہ نفس ناطقہ کی ضرورت کمال پر فائز ہونا ہے وہ ہر چیز نفس ناطقہ کے لئے جو اس کو کمال تک پہنچنے میں مدد دے یہاں سے ردعمل کے وہ تمام نتائج حسن کی تعریف سے خارج ہو گئے جو نفس ناطقہ کے عروج و ارتقاء میں مانع ہوں مثلاً عریاں تصاویر' فحش افسانے اور اشعار یا شراب کی قسم کے مشروبات و ماکولات کا ردعمل۔ حسن کی تعریف میں حقائق الاشیاء کو بھی بڑا دخل ہے اس لئے اشیاء کے حقائق کی بناء پر حسن کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے۔

حسن کی تعریف حقائق کی زبان میں ہم اس طرح بھی کرسکتے ہیں "اسم ظاہر کی تجلی جو اسم مصور اور اسم بدیع کے تقاضوں کی مظہر ہو' حسن ہے" اس بیان کی روشنی میں حسن کے متعلق کچھ نہ کچھ سمجھنے میں مدد ملنے کی امید ہے دوسرا لفظ عشق ہے محققین کے مذہب کے مطابق عشق کی تعریف بھی ایسی نہیں ملتی' جو عشق کی ماہیت بتائے اور وہ اعتراضات جو عشق پر' جہل کی وجہ سے کئے جاتے ہیں مرتفع ہو جائیں عشق کی شاعرانہ تعریف شیفتہ نے یوں کی ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے' شیفتہ!
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

حضرت میکش اکبر آبادی حسن و عشق کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

عشق ہے میرے دل کا نام' حسن مری نگاہ کا

راقم الحروف کا ایک شعر بھی اس سلسلے میں قابل ہدیہ ہے۔

حسن ہے اعتبار' عشق احساس
دیدہ و دل مگر نہیں سکتے

عشق کی حسب ذیل تعریف' ادراک کو عشق کے مفہوم احساس سے قریب کر سکتی ہے۔

"وہ نفس ناطقہ کا وہ انفعال جو اس کے کمال کا مقتضی ہو' عشق ہے" عشق کا لفظ تصوف اور تغزل دونوں میں متداول ہے غزل میں عشق کی دو قسمیں مسلم ہیں عشق حقیقی اور عشق مجازی ان دونوں کے موضوع باہم مختلف ہیں ایک سے دوسرے کا کوئی تعلق نہیں۔

ہمارے زمانے میں ایک طبقہ محرمان علم و فکر کا ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ اس کو قرآن حکیم سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم ارباب تحقیق کے سامنے اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ لفظ عشق' قرآن حکیم میں چونکہ مذکور نہیں ہوا ہے اس لئے عشق کا تعلق قرآن اور اسلام سے نہیں ہے اسی بنیاد پر اصطلاحی عشق یا عشق حقیقی پر وہ ایسے اعتراضات کرتے ہیں جو شاہدان بازاری کے عشق کا خاصہ ہیں۔

قرآن کریم میں عربی صرف کے بعض ابواب استعمال نہیں ہوئے ہیں اس لئے کیا یہ دعویٰ عربی زبان کے لئے درست ہو سکتا ہے کہ چونکہ فلاں فلاں باب قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوئے ہیں اس لئے عربی زبان میں ان کا استعمال خلاف قرآن ہے۔

اسلام نے آکر دنیا میں سینکڑوں ایسے علوم وفنون کا انکشاف کیا جس کا ذکر قرآن میں نہیں تو کیا اس سے ازروئے قرآن ان علوم کے عدم یا خلاف قرآن ہونے پر استدلال درست ہو سکتا ہے علم تفسیر' علم حدیث اور علم فقہ وغیرہ کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اصطلاحات ایسی ہیں جن کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو کیا کوئی ذی علم یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ اصطلاحات محض اس لئے ناقابل قبول ہیں کہ یہ الفاظ قرآن میں نہیں آئے اور پھر اصطلاح کے لئے فلسفیوں کا یہ مقولہ ایک قانون کا حکم رکھتا ہے "لا مشاحۃ فی الاصطلاح" اصطلاح کے تسلیم کر لینے میں اختلاف نہیں ہے۔

جو حضرات اصول علیہ کو ترک کر کے گفتگو کرتے ہیں اور اپنے فیصلے کی بنیاد اپنے

مفروضے پر رکھتے ہیں اور اپنے عقیدے کی حمایت میں ایسا استدلال پیش کرتے ہیں جو بارگاہ علم میں مجروح و مخدوش ہے' انکے عقیدے کی صداقت ثابت ہی نہیں ہو سکتی۔

تصوف میں آکر جہاں بادہ و ساغر ساقی و مینا کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے وہاں عشق میں وہ تقدیس اور وہ طہارت ثابت ہو جاتی ہے جس کے بیان کے لئے بعض الفاظ کے متعینہ معنی ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہی حال عشق اور عشق حقیقی کا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں یہ چند تعریفیں اور بعض اصطلاحات پر اشارے کر دینے کے بعد ہمیں اصل موضوع کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

یہ حقیقت سب نے تسلیم کی ہے کہ غزل میں جان صوفیا کے افکار سے پڑی ہے صوفیا حضرات کے خیالات کی بنیاد اکثر ایسے ہی مسلمات اور حقائق پر ہوتی ہے جن کی طرف اشارہ کیا گیا' وہ علم موجودات کی کثرت کے ہر فرد کا مشاہدہ حقیقت کی آنکھ سے کرتے ہیں اور انہیں موجودات مقیدہ میں سے ایک حقیقت مطلقہ واحدہ کا مشاہدہ ہوتا ہے اشیا سے مجاز کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔

عالم موجودات ہی میں حسن و عشق کی جلوہ فرمائیاں نظر آتی ہیں حسن اپنی عظمت و تجمل کے ساتھ اپنے مظاہر میں شدت کے ساتھ ظاہر اور عشق اپنے متعینات میں ایک لمحے کے کم سے کم وقفے کے لئے بھی معطل نہیں ہے اسی ظہور نے نل دمن' لیلی مجنوں' شیریں خسرو' گل و بلبل' شمع و پروانہ اور قمری و سرو کی واقعی اور اعتباری داستانوں میں کوٹ کوٹ کر بجلیاں بھر دیں۔

ذمین صاحب کی غزل میں حسن کا مظہر یعنی معشوق ایک ایسا موجود ہے جس میں شرافت انسانی کی تمام خصوصیات بمرتبہ اتم پائی جاتی ہیں اسی طرح عشق نے جس پیکر میں ظہور کیا ہے وہ پیکر بھی اکمل و افضل ہے یہاں تک کہ جب وہ محبوب سے محبت کرتا ہے تو اس محسوس اور واقعی جسمانی دوئی کو برداشت نہیں کر سکتا یہیں سے عشق مجازی کے لئے عشق حقیقی کی طرف ایک پگ ڈنڈی نکل جاتی ہے۔

ذمین صاحب کے کلام خصوصاً غزل میں حسن و عشق کے واردات اور معاملات نہایت کثرت اور شدت سے ملیں گے لیکن ان میں شرافت فطرت اور عصمت و عفت کے جوہر ملیں گے جو مادیت کی بجائے عالم روحانیت کے پیغمبر ہوں گے اس مقام پر ہم غزل کی

کھلی ڈلی اصطلاح کا ذکر نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کو معاملہ بندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ معاملہ بندی سے مراد عاشق و معشوق کا وہ ربط ہے جس میں کسی دوسرے کو دخل نہ ہو نظام رام پوری کا ایک شعر ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

داغ دہلوی کہتے ہیں۔

یہ داغ پر فن بری بلا ہے تم اسکو ہرگز نہ منہ لگانا
تمہیں یہ لائیگا اپنے ڈھب پر سنیں اگر اس کی چار باتیں

مگر ذہین صاحب کی متغزلانہ معاملہ بندی کا نمونہ یہ ہے۔

خاک سے لالہ و گل سنبل و ریحان نکلے
تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارمان نکلے

اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ ارمان کو عاشق کی طرف منسوب کیا جائے گا تو شعر کا مطلب عاشق کا نظارے کا ارمان ہوگا اور جب اس کو معشوق کی طرف مضاف کیا جائے تو معشوق کی خود نمائی اور بے پردہ ہونے کا ارمان مراد ہوگا۔ ذہین صاحب کی غزلیہ شاعری میں اسی قسم کی لطافتوں کی بجلیاں بکثرت ملتی ہیں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔

قریب جلوہ گاہ یار شاید ہوتا جاتا ہوں
کہ مجھ سے کائنات ہوش رخصت ہوتی جاتی ہے

○

حسن و خوبی میں بے مثال ہیں آپ
عشق میں بے نظیر ہیں ہم لوگ

ہماری نگاہیں فقط حسن عنوان
محبت کا افسانہ ان کی نگاہیں

بہت کچھ وہ تسکین فرما رہے ہیں
مگر اور کچھ کہہ رہی ہیں نگاہیں

نہ سمجھے گل رخوں کے ہم اشارے
ہمیں پتھر نہ مارے پھول مارے

بن گیا معیار اچھائی برائی کا یہی
جسکو تم نے کہا اچھا وہی اچھا رہا

وہ التفات کسی کا مجھے تو راس آیا
کوئی بتائے کسی اور کو بھی راس آیا

محبت دوستی ہے دشمنوں سے
ہوئے ہیں دل کے دشمن دل کے پیارے

سنور جائے گا خود ہی نظم عالم
کوئی پہلے ترے گیسو سنوارے

چمن میں رنگ و بو شرما رہے ہیں
یہ کس نے کہہ دیا وہ آ رہے ہیں

خطاب اوروں سے اس انداز میں ہے
وہ جیسے مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں

سلام آیا نہ کچھ پیغام آیا
تغافل ان کا میرے کام آیا

پوچھتے ہو کہ ہے ارماں کوئی
دل میں ارمان کہاں سے آئے

ہوا جب درہم و برہم زمانہ
بہت یاد آئے وہ گیسوئے برہم

○

چمن طراز بہاروں میں بھی سکوں نہ ملا
مگر گلوں سے وہ رخسار لالہ گوں نہ ملا

سوئے ہوئے جنوں کو جگا کر چلے گئے
آئے تھے خواب میں کہ نہ آئے تھے خواب میں

نہ بے رخی ہو تو پھر کیا بری ہے بے مہری
ترے ستم کو بھی احسان جانتا ہوں میں

BZSTRFT

چشم خفتہ کا مقدر دولت بیدار عشق
خواب میں یوسف زلیخا کو نظر آتا رہا

وجدان واذہان سے شعر کی مطابقت

یہ ایک ایسا عنوان ہے جو ذمین صاحب کا شعر یا غزل ادراک میں ابھارتا ہے اور یہ عنوان بھی ان اسباب میں سے ایک سبب ہے جس سے ذمین صاحب کی انفرادیت یا صاحب مذہب ہونا ثابت ہوتا ہے اس مقام پر دو نکتوں کا ذکر کئے بغیر ہم اصل مدعا بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

پہلا نکتہ، شعر کی حقیقت یا ماہیت یہ ہے کہ وہ ایک آپ بیتی کیفیت یا واردات ہے جو مضطربانہ زبان پر آتی ہے اور اس کا مخاطب اپنی ذات یا اپنی شخصیت کے سوا دوسرا نہیں ہوتا یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ شاعر اس مقام پر مطلقاً "لاعلم ہوتا ہے کہ وہ اپنا مخاطب اپنے آپ ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ فلسفیانہ طور پر کسی شاعر کی انفرادیت ثابت کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ جس نقطے پر انفرادیت ثابت کرنی ہو اس نقطے پر تمام شعرا کو مجتمع کرلیا جائے پھر ان خصوصیات کو جو تمام شعرا میں پائی جاتی ہیں صاحب مذہب شاعر سے ایک ایک کرکے جدا کردیا جائے آخر میں جو خصوصیات باقی رہ جائیں گی وہی اس صاحب مذہب شاعر کی خصوصیات خاصہ ہوں گی یہ نکتہ ہمارے مقصد کے حصول کے لئے اصول موضوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ذمین صاحب کے کلام میں تصوف پایا جاتا ہے اور تصوف بھی ٹکسالی۔ جذب کے علاوہ مقامات تصوف آپ کے کلام سے بالترتیب اخذ کئے جاسکتے ہیں اس شرط نے اردو کے ان تمام شعراء کو ذمین صاحب سے الگ کردیا ہے جو صوفی نہیں ہیں صرف وہ صوفی شعرا رہ گئے ہیں جو خالص تصوف کہتے ہیں مگر صوفی شاعروں میں غالب ایک ایسا شاعر ہے جو اس صفت میں ان کا شریک رہ جاتا ہے مگر اہل نظر اور سلیم المذاق لوگوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ غالب کا تصوف علمی اور کتابی ہے اس لئے غالب کا نام بھی اس سلسلے میں نہیں لیا جاسکتا ذمین صاحب ایک صاحب حال شاعر ہیں علمی اور کتابی شاعر نہیں ہیں۔

اقبال کا ذکر بھی اس سلسلے کا ضروری حصہ ہے ان کے یہاں کھرا تصوف ملتا ہے مگر اس کا انداز فکر اور طریق استدلال صوفیانہ کے مقابلے میں حکیمانہ زیادہ ہے اس لئے خصوصیت زیر بحث میں اقبال کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

اب کچھ اشخاص ایسے رہ جاتے ہیں جو ذمین صاحب کے شریک ہیں ان میں سب سے مقدم حضرت خواجہ میر درد، حضرت شاہ نیاز بے نیاز، مولانا اصغر گونڈوی اور جناب میکش اکبر آبادی ہیں مگر ان بزرگان محترم کے کلام میں باہم امتیاز نمایاں ہے۔

خواجہ میر درد کا کلام سپاٹ ہے اور یک رنگ، مگر ذمین صاحب کے انداز بیان میں تنوع اور شگفتگی ہے۔

حضرت شاہ نیاز بریلوی تمام مراتب وجود نہایت بلند آہنگی سے بیان فرماتے ہیں اس طرح کہ اگر آج اردو کے ذخیرہ ادب سے تصوف کسی وجہ سے ناپید ہوجائے تو حضرت شاہ نیازؒ کے کلام سے اسے دوبارہ موجود کیا جاسکتا ہے لیکن آپ کا کلام اصطلاحات اور قدیم اردو سے معمور ہے اور یہی ذمین صاحب کے کلام اور حضرت شاہ نیاز بریلویؒ کے کلام کا مابہ الامتیاز ہے ذمین صاحب کی اردو آج کی فصیح اردو ہے اور اس میں اصطلاحات کا نام ونشان نہیں ہے باوجود اس کے تمام مراتب سلوک کی نشاندہی آپ کے کلام سے کی جاسکتی ہے مولانا اصغر کے کلام میں تشبیہات واستعارات کی کثرت مدفاصل ہے۔

حضرت میکش اکبر آبادی کے کلام اور ذمین صاحب کے کلام میں حد فاصل اظہار واخفا ہے میکش اپنے مشاہدات و واردات کو تہ در تہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سوائے اہل حال کے ان کے کلام کا بنیادی نقطہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ذمین صاحب اور حضرت میکش کے کلام میں حد امتیاز "اخفا" اور "اظہار" ہے میکش صاحب کا شعر ہے۔

بے دلی سے تم رہے معبود جان ودل تو کیا
اس خدائی سے تو اپنی بندگی اچھی رہی

ذمین صاحب کا کہنا ہے کہ

حسن وخوبی میں بے مثال ہیں آپ
عشق میں بے نظیر ہیں ہم لوگ

مرقومہ بالا دونوں اشعار کے نکتوں میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے یہی ہے وہ شعر

کی ماہیت اور ذہین صاحب کا تصوف۔ ذہین صاحب پر کوئی کیف طاری ہوتا ہے تو ہیں اسی عالم میں ان کی زبان پر بعض الفاظ آتے ہیں اور وہ الفاظ ایک عبارت اور عبارت سے شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں جب یہ کیفیت یا آپ بیتی زبان پر آتی ہے تو انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ

اللہ رے چشم یار کی معجز طرازیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

ہر مصرعہ، ہر شعر صاحبان حال و وجدان کے ادراک و ذہن کے مطابق ہوتا ہے اور ہر سننے والا، ہر سمجھنے والا، اپنے ادراک ہی نہیں بلکہ وجدان میں بھی اس کیفیت کو پاتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ ذہین صاحب کا کلام عام وجدان اور عام ذہنوں کے عین مطابق ہوتا ہے مثالیں ایسے اشعار کی ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

اچانک قلب دھڑکا۔ سانس پھولی پاؤں تھرائے
وہ ہم سے کچھ قریب آئے کہ ہم ان کے قریب آئے

○

وہ جدھر جھومتے چلے آئیں
خود برستی ہوئی شراب آئے

○

جو آپ راہ نہ جانے وہ کیا دکھائے راہ
وہ رہنما بھی ترستا ہے رہنما کے لئے

○

صورت نظر آتی ہے تو سیرت نظر آئے
انسان بہت ہیں مگر انسان کہاں ہے

○

ادائے جانستاں جاں آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ دل آزار کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے

○

مجھکو تو صبر تھا ستم گاہ گاہ پر
یہ بھی اگر برا ہے تو اچھا نہ کیجئے

○

یہ آسماں، یہ مہ و مہر، یہ ستارے ہیں
ہمارے ہاتھ نہ آئیں تو کیا ہمارے ہیں

○

ہستی سے اپنی دہر عبارت ہے اے ذہین
جب میں نہیں جہاں میں تو پھر کیا جہاں میں ہے

سہل ممتنع

سہل ممتنع ایسے کلام سے عبارت ہے کہ اگر اسے سنیں تو یہ سمجھیں کہ ایسا شعر آسانی سے کہا جاسکتا ہے مگر جب شعر کہیں تو معلوم ہو کہ ایسا شعر کہنا بہت دشوار ہے۔ ایک نازک سے نازک اور دقیق سے دقیق مضمون کو اس طرح بیان کرنا کہ عام لوگ اسے سمجھ لیں شاعری میں بہت مشکل ہے استاد ذوق کا مطلع ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

"مسئلہ جبر" اس شعر میں اس آسانی سے بیان کیا گیا ہے کہ سنتے ہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا شعر کہنا آسان ہے مگر اسی کو غالب کی زبان سے سنئے۔

کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

ذہین صاحب کے کلام میں سہل ممتنع کے بھی اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

دل کی کیا بات ہے تم ہی دل ہو
دل سے کیا بات چھپاؤں دل کی
دل سے جاکر تو دکھاؤ مجھ کو
میں کرامات دکھاؤں دل کی

یہ ذرے کہیں چاند تارے ہوئے ہیں
ہم اپنی نگاہوں کے مارے ہوئے ہیں

BZSTRFT

گلے ملتی ہیں جو دریا میں موجیں
یہی اک موج تم ہو دوسری ہم

○

اور اللہ کا کرم کیا ہے
آپ اللہ کا کرم ہیں ہم

○

کیوں نہیں ہے زباں پہ دل کی بات
اس قدر رازداریاں کیوں ہیں

○

وہ شب غم بہت ہی یاد آئے
ہم کو خود ہم بہت ہی یاد آئے

○

کھلے خاک سے گل ملے خاک میں گل
بدلتی ہیں کیا کیا قبائیں بہاریں

تصوف

شاعری اور تصوف کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شیخ سعدی کی عظمت شاعرانہ کی بنیاد ہی اس پر ہے۔ سب سے پہلے غزل میں آپ ہی نے تاثرات حسن و عشق کے پردے میں تصوف کو داخل کیا اردو غزل جوں کی توں فارسی غزل کا پرتو ہے اس لئے اردو زبان کی تخلیق و تعمیر میں تصوف ایک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذہین صاحب کے کلام میں تصوف کا غلبہ ہے مگر چونکہ یہ غلبہ تغزل کے پردے میں ہے اس لئے اس میں وہ خشکی نہیں پائی جاتی جو تصوف کا خاصہ ہے اسی لئے صریحی طور پر اس کا سمجھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

مقام کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے علمی طور پر مراتب ستہ اور تنزلات خمسہ کا تفصیلی ذکر کیا جاتا پھر ان کے متعلقات ولوازم کی تصریح کی جاتی اس کے بعد ذہین صاحب کے شعر سے

اخذ کیا جاتا اگر میں ایسا کرتا تو یہ مقالہ تعلیمات اور اصول تصوف کی ایک اچھی خاصی کتاب بن جاتا اس لئے اپنے محولہ موضوع کے پیش نظر میں ذہین صاحب کے کچھ شعروں کی ایسی شرح پیش کرتا ہوں جو تصوف سے علمی مطابقت رکھتی ہے اس طریق کار سے نہ صرف یہ کہ اختصار میں مدد ملے گی بلکہ نفس حقیقت کی مثالیں سامنے آنے کی توقع ہے حضرت ذہین کا ایک شعر ہے۔

دور جاکر دیکھنا تھا پاس آکر دیکھنا
تیرا پردہ تھا تجھے پردہ اٹھاکر دیکھنا

اس شعر میں صرف اس قدر مضمون بیان کیا گیا ہے کہ حسن ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والا اس کو دیکھ ہی نہیں سکتا اور اس مضمون کی ادائیگی کے لئے پیرایہ بیان یہ اختیار کیا گیا کہ عاشق اپنے محبوب کے حضور میں حاضر ہے اور اس کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے محبوب! مجھے تیرے دیدار کی آرزو بعد تھی تو نے میری یہ تمنا پوری کردی مگر واقعہ یہ ہے کہ میں تجھے دیکھ ہی نہ سکا کیونکہ جب تو نے اپنی تجلی دکھانے کے لئے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھے اجازت دی کہ میں پردہ اٹھا کر تجھے قریب سے دیکھ لوں تو جیسے ہی کہ میں نے پردہ اٹھانا چاہا میری آنکھوں کے سامنے چکاچوند پیدا کردینے والی ایک برق جمال چمکی جس سے آنکھیں ایسی چندھیا گئیں کہ میں تجھے نہ دیکھ سکا یعنی تیرے پاس پہنچ کر اور پردہ اٹھا کر تجھے دیکھنا ایسا تھا جیسا کہ فاصلہ بعید سے تجھے دیکھا ہو۔ علم مناظر و مرایا کے لحاظ سے "دور" سے مراد وہ فاصلہ ہے جو حد رویت سے زیادہ ہو اگر ایک چیز سو گز کے فاصلے سے صاف نظر آتی ہے تو ہزار گز کے فاصلے پر وہ بالکل نظر نہیں آئیگی اس دیکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاس آکر دیکھنا ایسا ہی ثابت ہوا جیسے ایک میل کے فاصلے سے دیکھنا یعنی بالکل نہ دیکھنے کے برابر۔

یہ مضمون نفسیاتی طور پر ممکن الوقوع ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک فرقت زدہ عاشق اپنے محبوب کو بالکل قریب سے بے پردہ دیکھے تو لذت دید سے بے ہوش ہو جائے اور اس پر ایک ایسا عالم حیرت طاری ہو جائے کہ باوجود قریب ہونے کے محبوب کو نہ دیکھ سکے۔ غشی یا حیرت دنوں مانع نظارہ ہیں نتیجہ بہرحال محبوب کو نہ دیکھ سکنا ہے یہ وہ مفہوم ہے جو شعر کے الفاظ سے متبادر فی الذہن ہوتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ شعر کے الفاظ نے جو مفہوم ذہن پر مرتسم کیا ہے وہ دراصل اس کا ایک پرتو ہے جس کو شاعر کے وجدان نے قبول کیا ہے۔

اس شعر کے صوفیانہ معنی سمجھنے کے لئے بطور تمہید حسن کی تعریف کا اعادہ ضروری ہے صوفیا کے نزدیک "حسن" شیون ذاتیہ میں سے ایک شان ہے مگر یہ مسئلہ بھی ذرا تفصیل طلب ہے اس کی مجملاً تفصیل یہ ہے کہ اصل بنیاد' وجود مطلق' حضرت رب العزت ہے موجودات اسی وجود کے تعینات ہیں جو طرح طرح کے مختلف اور متضاد لباسوں میں جلوہ گر ہے تخالف اور تقابل اس وجود کے ظہور کا تقاضا ہے اصل ماہیت ایک ہے اس کی دو نسبتیں ہیں ایک ازل دوسری ابد' اس کے دو وصف ہیں ایک وجوب دوسرا امکان' اس کے دو مظہر ہیں ایک جوہر دوسرا عرض' اس کے دو نام ہیں ایک عبد' دوسرا رب اور اس کے دو احساس ہیں ایک حسن' دوسرا عشق۔ اسی مفہوم کو ذ مین صاحب نے یوں ادا کیا ہے۔

عشق کی ایک تجلی کے ہیں دو نام ذ مین
شمع بن جاتی ہے پروانہ بنا دیتی ہے

شاعر کا وجدان یہ ہے کہ وہ کائنات کے ایک ایک موجود کے رخ سے تعین اور تشخص کا پردہ اٹھا کر جب اس حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے جو تعین و تشخص کے لباس میں ملبوس ہے تو اسکی نظر ایک ایسے جلوے سے دوچار ہوتی ہے جو نہ صرف قوت باصرہ بلکہ قوائے حسیہ کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو شدت سے چمکنے والی بجلی' آنکھوں کے ساتھ کرتی ہے اس عمل سے وہ جس حقیقت کے مشاہدے تک بڑھا تھا اس کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا اور اس کا علم اور وجدان اس طرح متاثر ہوتا ہے کہ اطلاقی شان کو پاس آکر دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوسوں کے فاصلے سے دیکھنا یعنی جس طرح یہ شان کوسوں کے فاصلے سے نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی طرح قریب سے دیکھنے پر بھی نظر سے اوجھل رہتی ہے نتیجہ یہ نکلا کہ۔

پاس آکر دیکھنا تھا دور جا کر دیکھا

کیا نہ دیکھا یہ کہو یہ نہ کہو۔ کیا دیکھا
ہم نے جو کچھ بھی کسی بزم میں دیکھا دیکھا

پیرایہ بیان کے معنی یہ ہیں کہ انداز بیان اہل زبان کی روزمرہ سے اقرب بھی ہو اور وہ اس اقربیت کے اس میں تنوع اور ندرت بھی پائی جائے تو شعر' سحر سامری بن جاتا ہے

یا اعجاز کلیم۔ ذ مین صاحب کا مرقومہ بالا شعر اس ندرت بیان کا ایک دلکش نمونہ ہے ایک سائل سوال کرتا ہے کہ یہ تو فرمایئے آپ نے اس محفل میں جس میں آپ شریک تھے کیا کیا دیکھا؟ تو مجیب جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے اس محفل میں سب کچھ دیکھ لیا ہے مگر اپنے مفہوم کے اظہار کے لئے اس سیدھے سادے انداز بیان کو ترک کر کے ایک نہایت اچھوتا انداز بیان اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے سائل! یہ کیا سوال ہے کہ میں نے کسی کی انجمن جلوہ گری میں کیا دیکھا۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو نہیں دیکھی' انجمن آرائی کے تمام لوازمات' فرش فروش' چاندنی' مسند' نغمہ و بادہ' جھاڑ فانوس' نکہت کا طوفان' خوش لباسی کی دلکشی' ہم رنگ شرکائے محفل اور خود صاحب انجمن کی جلوہ گری' محفل کا ماحول اور اس کا قرب و جوار ازل سے لے کر ابد تک وہ کون سی چیز تھی جو میں نے نہیں دیکھی مختصر یہ کہ۔

فاوحی الی عبدہ مااوحی

ہم نے جو کچھ بھی کسی بزم میں دیکھا دیکھا

یہ تمام کرشمہ دو جملوں کا ہے :

کیا نہ دیکھا یہ کہو یہ نہ کہو کیا دیکھا

یہ انداز بیان جس قدر اہل زبان کی روزمرہ کے مطابق ہے اس سے کہیں زیادہ نادر اور دلکش ہے اور ایک ایسا امین ہے کہ جو امانت اس کو سپرد کی گئی ہے اس کے ادا کرنے میں نہایت کامیاب ہے۔

شعر کے باب میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بہترین شعر وہی ہے جس میں حقیقت اور مجاز ایک ہی شان سے پائے جائیں۔ ذ مین صاحب کا یہ شعر اسی کلیہ کا مصداق ہے اور اس میں "کسی بزم" کا ٹکڑا ایک ایسا قرینہ ہے جس کی وجہ سے حقیقت اور مجاز میں مساوات پائی جاتی ہے اس ٹکڑے سے تغزل کی ایسی دنیا کی طرف راستہ نکلتا ہے جس سے ایک خوش مذاق ادراک لطف اندوز ہوتا ہے اور خاص یہی ٹکڑے سے وہ ذہن جو موجودات کائنات کی واقعیت کو سمجھتا ہے ایک ایسے عالم کی طرف نکل جاتا ہے جس کے مشاہدات کے بیان کے لئے نہ الفاظ کافی ہوتے ہیں نہ تعبیر اور جہاں قوت ناطقہ اپنے ادراکات کو بیان کرنے کے لئے مچل مچل کر رہ جاتی ہے وہ شاعر نہایت قادر الکلام ہے جو

ایسے مدرکات محسوسات اور کیفیات کو اس طرح بیان کردے کہ سننے اور سمجھنے والا بھی اسی عالم میں پہنچ جائے جس عالم میں شعر کہا گیا ہے۔

تغزل سے قطع نظر شعر کے اصل مفہوم کو سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی ضرورت ہے اہل نظر نے حصول یقین کے لئے دو طریقے مقرر کئے ہیں ان میں سے ایک طریقہ حکیمانہ ہے جس کو استدلال کہتے ہیں اور دوسرا طریقہ عارفانہ ہے۔ جس کو استکمال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حصول یقین کے لئے استدلال عام اور آسان ہے مگر اس طریقے میں اوہام و شکوک سے واسطہ زیادہ پڑتا ہے اس کے اساتذہ بھی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ استکمال دراصل کشف کو کہتے ہیں اس طریقے میں اوہام و شکوک کا گزر کم ہے مگر اس فن کا استاد گوگرد احمر کا حکم رکھتا ہے۔

ایک صاحب وجدان اور فکر صحیح کا مالک جب انفس و آفاق کی تفصیل پر اپنی نظر علمی و فکری ڈالتا ہے تو ازل سے ابد تک پورے زمانے کو اپنی نظر کے تحت پاتا ہے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر جب علم الٰہیہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو اس پر نہ صرف زمانے بلکہ ازل و ابد کی حقیقت منکشف ہوتی ہے اور وہ عالم حضرت علم میں اپنے آپ کو قائم پاتا ہے اس وقت اس پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ کائنات اپنی تمام ازلی و ابدی تفصیل کے ساتھ اس کے سامنے ایسی ہوتی ہے جیسے ہاتھ کی ہتھیلی۔ یہ ایک ذوقی اور وجدانی کیفیت ہے۔

موجودات کا یہ عالم جو ذہن و خارج کو جامع ہے عاشق کو اپنے محبوب کی بزم ناز معلوم ہوتا ہے اور عاشق خود کو انجمن محبوب میں پاتا ہے اور حسن و عشق کے ربط باہمی سے اس کے پیکر عنصری میں جو تاثر پیدا ہوتا ہے دیکھنے والے اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔

اسی قسم کے ایک عاشق صادق کو کوئی شخص دیکھتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ آج تو آپ کی رسائی بڑی بزم تک ہوئی ذرا ہمیں بھی تو بتایئے کہ آپ نے انجمن جمال میں کیا دیکھا؟ عاشق اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اے سائل! تو مجھ سے یہ نہ پوچھ کہ میں نے کسی انجمن جمال میں کیا دیکھا؟ بلکہ مجھ سے یہ سوال کر کہ وہ کون سی چیز تھی جو میں نے دیکھی میں نے اس بزم جمال میں جو کچھ دیکھا ہے اس کی حقیقت فاوحی الی عبدہ ما اوحی ہے۔

قرآن کریم میں لوح محفوظ کا ذکر ہے جو علم الٰہیہ سے عبارت ہے اور اسی کتاب حکیم

میں **اقراء کتابک** کا ٹکڑا بھی پایا جاتا ہے جو اپنی ہستی کے مطالعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس وجدان اور اس مشاہدے کو چار جملوں میں اس طرح ادا کرنا :

کیا نہ دیکھا یہ کہو یہ نہ کہو کیا دیکھا
ہم نے جو کچھ بھی کسی بزم میں دیکھا‘ دیکھا

اس شعر کا ایک ایک جملہ‘ بلکہ ایک ایک کلمہ‘ معنی کا ایسا زبردست امین ہے جو اپنی امانت کو باحسن وجوہ ادا کرتا ہے اور اس مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے جس کو میں نے اشارات کی زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ شعر جس وقت اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے جس کی مختصر تفصیل پیش کی گئی ہے عین اسی وقت یہی شعر حسن و عشق کے مضامین یعنی تغزل کا ایک ایسا مظہر ثابت ہوتا ہے کہ علم و احساس پر ادراک کے ساتھ ہی رقص کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اب ایک شعر اور ملاحظہ فرمایئے :

وہ آئینہ کبھی منہ دیکھتے تھے جس میں تم اپنا
لئے بیٹھا ہے آغوش تہی میں عکس گم اپنا

شعر نہایت صاف اور اثر انگیز ہے مضمون صرف اس قدر بتایا گیا ہے کہ عاشق کے سامنے سے محبوب ہٹ گیا اور اب عاشق لذت حضوری کا خیال ہی میں مزا لے رہا ہے

نظیری کہتا ہے۔

ہر متاعے کز نگاہش می خرم در روز وصل
می نشینم گوشہ و از خود مکرر می خرم

مگر شعر میں بعض قرائن ایسے پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے حقیقت و مجاز ایک ہی نقطے پر مجتمع نظر آتے ہیں معنی مجازی کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے البتہ حقیقت سے اعتنا کرنا باقی ہے چنانچہ زمین صاحب کے شعر میں لفظ "آئینہ" استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے مگر یہی لفظ "آئینہ" ایک اصطلاحی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

توریت کی ایک آیت ہے جس کا اردو ترجمہ یہ پایا جاتا ہے کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اور اسی مضمون کی ایک حدیث بھی ہے۔

ان اللہ خلق آدم علی صورتہ

اس کا ترجمہ قریب قریب وہ ہی ہے جو توریت کی آیت کا ہے یعنی حضرت آدمؑ کے روپ کے مشاہدے سے وجود مطلق حضرت حق جل مجدہ نے اپنی ذات وصفات اطلاقی کا مشاہدہ فرمایا اور مقصد تخلیق یعنی مقصد عرفان پورا ہوا جس پیکر یا جس مظہر میں کوئی ذات اپنا معائنہ ومشاہدہ کرے اسی محل مشاہدہ یعنی پیکر کا نام آئینہ ہے۔

شعر کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے آئینے کے متعلق بعض نکات قابل بیان ہیں تخلیق آئینہ سے آئینہ گر کی حکمت یا حب وعشق کا تقاضا پورا ہوا جو تخلیق آئینہ کی محرک تھی آئینے بیچارے پر یہ بیتی کہ نہ تو اس کو یہ عرفان ہوا کہ میں آئینہ ہوں اور نہ وہ یہ ادراک کر سکا کہ اس میں کوئی عکس ہی منعکس ہے۔ آئینہ کی یہ حالت اس امر کی متقضی ہوئی کہ وہ بھی اپنی ماہیت اور اپنی صفت انعکاس سے واقف ہو اس لئے اس آئینہ سے جس کا نام آدم ہے عکس کے ذریعے ایک اور ایسا آئینہ تیار کیا گیا جس میں آدم یعنی آئینہ خود اپنی جلوہ گری دیکھ سکے اس آئینہ در آئینہ کا نام حوا قرار پایا اس تخلیق سے ایک ہی حقیقت تین نسبتوں سے منسوب ہوگئی۔

صوفیا میں ایک قول متداول ہے بندے کے لئے تجلی ذاتی ایک آن کے لئے ہوتی ہے یعنی اس تجلی میں قرار ودوام نہیں ہوتا اس مقام تک پہنچنے کے بعد اب شعر کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

عاشق اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ جس آئینہ میں کبھی تم اپنا جلوہ جمال دیکھا کرتے تھے آج وہ آئینہ بغیر عکس کے سونا ہے اور اپنی خالی آغوش میں اپنا کھویا ہوا عکس لئے بیٹھا ہے اس عبارت میں دو لفظ خاص طور پر غور طلب ہیں مخاطب سامنے موجود ہے یعنی ضمیر "تم" کا مرجع یا آئینہ دیکھنے والا دوسرا لفظ ہے "عکس گم" یعنی وہ عکس جو آئینہ میں موجود نہ ہو آئینہ ایک استعارہ بھی ہوا اور ایک اصطلاح بھی اس طرح سے ایک لفظ میں ایسی جامعیت پیدا ہوگئی جو اظہار مقصود کے لئے نہایت ضرور اور مفید ہے۔

ضمیر کا مرجع اور عکس کی ماہیت سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جس طرح حضرت وجود مطلق، آدم وحوا سے ایک مثلث مرتب ہوتا ہے اسی طرح تماشائی آئینہ اور

عکس سے بھی ایک دوسرا مثلث مرتب ہوتا ہے اور یہ دونوں مثلث بہرحال متساوی الاضلاع ہیں ان کی باہمی نسبت اس طرح ہوگی کہ ساق ذاتی برابر ساق آئینہ کے اور عاشق یعنی "عکس گم" کو اپنے پہلو میں لیکر بیٹھنے والا برابر ساق حوا کے اب ہر دو مثلث کے تمام اضلاع نہ صرف یہ کہ متساوی ثابت ہوئے بلکہ دونوں مثلث اس طرح واقع ہوئے کہ مثلث اول کو مثلث ثانی ڈھک لیتا ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا یہ ایک ایسی ذوقی یا وجدانی حقیقت ہے جو واقعہ کے عین مطابق ہے مگر اس حقیقت کی تشریح جس طرح پیش کی گئی ہے اس میں کسی قسم کا ذوق، ترغیب یا شورش موجود نہیں ہے بلکہ یہ تشریح اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے عقل کو ایک سہارہ ہے مگر یہی حقیقت جب اس شعر کے لباس میں سامنے آتی ہے:-

وہ آئینہ کبھی منہ دیکھتے تھے جس میں تم اپنا
لئے بیٹھا ہے آغوش تہی میں عکس گم اپنا

تو زخمی دلوں اور فرقت کے مارے ہووں کے لئے یہی شعر ان کے وجدان کی ترجمانی بن جاتا ہے اور مجاز ایکا ایکی حقیقی لباس اختیار کر لیتا ہے اور اہل معاملہ کو مضطر و بیقرار کر دیتا ہے۔

اگر شعر کا تجزیہ و تحلیل اس انداز سے کیا جائے جو پیش کیا گیا تو ان لوگوں کو الجھن پیش آئے گی، جو اصل مقصود سے بے خبر ہیں مگر وہ لوگ جن کی نظر ہمیشہ مرکز تجلی پر مرکوز رہتی ہے بالکل نہیں الجھیں گے ان کے لئے تو شعر کے الفاظ اصل ماہیت تک رسائی کے لئے ایک بہانہ بن جائیں گے اور اہل مجاز، یعنی نرا شاعرانہ مذاق رکھنے والے لوگ

لئے بیٹھا ہے آغوش تہی میں عکس گم اپنا

سے ایک حیرت اور ایک لذت پائیں گے کیونکہ ان کے نزدیک آئینے کا جو عکس سے خالی ہو عکس کو پہلو میں لیکر بیٹھنا بجائے خود شعریت کے مترادف ہے اس کو وہ کبھی معنی آفرینی کہیں گے اور کبھی ایک لطیف اور نادر استعارہ سے تعبیر کریں گے۔ غرض یہ ہے کہ مرقومہ بالا شعر ایک ایسی میزان ہے جس سے حقیقت اور مجاز کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔

اخلاق

عملی اخلاق کے سلسلے میں محقق دوانی کا یہ قول کہیں نظر سے گزرا ہے کہ عوام سے اخلاق اکتساباً سرزد ہوتے ہیں مگر صوفیا سے اخلاق' اضطراراً عمل میں آتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ صوفیا اخلاق سے اس قدر متخلق ہوتے ہیں کہ ان کا تمام نظام عمل و حیات' اخلاق نبوی کا تبع ہوتا ہے اختیاراً اور اضطراراً صوفیا کا کردار "اخلاق" ہوتا ہے حالی اور شبلی وغیرہم نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ صوفیانہ شاعری میں اخلاق کے ہزاروں نکتے ایسے ملتے ہیں جن سے فلسفہ اخلاق کی کتابیں خالی ہیں۔

زمین صاحب کا شمار اس دور کے صوفیا میں ہوتا ہے ان کے کلام میں جس قسم کے اخلاقی حقائق ملتے ہیں ان کا اندازہ درج ذیل شعر سے ہو سکتا ہے۔

رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے زمین
چند اڑتے ہوئے سائے تھے گریزاں نکلے

زمین صاحب جس سلسلہ سلوک سے وابستہ ہیں اس میں یاس قنوطیت' حسرت' ناکامی اور نامرادی کا گزر نہیں ہے ان کے اشیاخ نے جس قسم کا راستہ ان کے لئے مقرر کیا ہے وہ راہ سرور و انبساط ہے زمین صاحب عارفانہ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک حساس شاعر بھی ہیں شاعری کے وہ تمام مضامین جو عام شعرا کے سامنے ہیں ان کے سامنے بھی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اپنے پرائے' عزیز' اقارب' آنکھوں کے سامنے سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں زمین صاحب بھی اس تجربے میں شریک ہیں شعر مرقومہ عنوان اسی مشاہدے کا تاثر ہے صرف انداز بیان کا فرق ہے۔ زمین صاحب نے اسی گلو کی کڑوی گولی پر شکر لپٹی ہے۔

رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے زمین   چند اڑتے ہوئے سائے تھے گریزاں نکلے

اور یہ آپ کے انداز فکر کا خاصہ ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے والوں کی دلکشی اور ان سے محبت کا اظہار "رنگ و بو کے قافلے" کے استعارے سے کیا ہے یعنی دنیا سے جانے والوں کی کثرت ہے اور یہ جانے والے' اسی طرح پیارے ہیں جیسے انسان کو رنگ و بو

پیارے ہوتے ہیں۔ رنگ و بو کا پیارا ہونا منجملہ مسلمات ہے دنیا سے جانے والوں کو "چند گریزاں سایوں" سے استعارہ کرنا' اعلیٰ درجے کی بلاغت ہے اس استعارے نے جو شعر میں ہے تاثیر کو نقصان نہیں پہنچایا البتہ حزن کو ختم کر دیا ہے۔

آخر میں علم معانی کے نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے فصاحت علم معانی کا ایک جزو ہے' جو شعر زیر جائزہ میں اپنی تمام شرطوں کے ساتھ پائی جاتی ہے علم معانی کا ایک جزو بلاغت بھی ہے بلاغت میں الفاظ کے برمحل اور حسب ضرورت استعمال کے ساتھ انداز بیان کو بھی بڑا دخل ہے۔ زمین صاحب نے ایک اخلاقی مضمون' غزل کے شعر میں نظم کیا ہے مگر انداز بیان کے سلسلے میں نہایت نکتہ سنجی سے کام لیا ہے یعنی' بیان میں تجرید کو ملحوظ رکھا ہے تجرید اگرچہ فلسفے کی اصطلاح ہے مگر شاعری میں اس کا استعمال برابر ہوتا رہا ہے تجرید کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شے سے اسی قسم کی دوسری شے منتزع کر لی جائے یہ شعر زمین صاحب کا ہے مگر انہوں نے خود کو ایک دوسری شخصیت قرار دیا ہے اور زمین کو اپنے علاوہ ایک مستقل شخصیت مان لیا ہے اسی کا نام تجرید ہے۔

زمین شاعر سے یہ سوال کرتا ہے کہ آپ دیکھتے ہیں دوست' احباب' عزیز و اقارب کیسے ہماری آنکھوں کے سامنے سے اٹھتے جا رہے ہیں دیکھنے والوں کا سینہ شق ہوا جاتا ہے شاعر جواب میں کہتا ہے: "زمین صاحب! سچ ہے یہ ایک رنگ و بو کا قافلہ تھا جس نے ہماری منزل میں قیام کیا تھا اور قافلہ راہ چلتے ہماری منزل میں ٹھہر گیا تھا اس میں بعض افراد رنگ تھے اور بعض اصحاب بو تھے ہمیں بھی ان سے محبت ہو گئی تھی مگر رنگ و بو کو غور سے دیکھا تو اصل حقائق نہ تھے بلکہ حقائق کے چند مضطرو بیقرار سائے تھے اس لئے جناب زمین میں آپ کی' ان کی جدائی سے بیقرار نہیں ہوں"۔

اس تجریدی انداز بیان میں جو ندرت اور لطافت ہے اس کا ایک معمولی فائدہ یہ ہے کہ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد اضطراب اور شکستگی کو ایک گونہ تسکین سی ہو جاتی ہے ایک ایسا شاعر جس کی نظر حقائق بلاغت پر رہتی ہے فکر شعر کے وقت بلاغت کے تمام نکتے بلاقصد اس کے کلام میں آجاتے ہیں ان نکتوں کو الفاظ و کلمات کے حجاب سے عوام کی نظر میں لانا ایک ناقد کا اہم فرض ہے اگر ایسا نہیں ہے تو ناقد کاغذ کی ناؤ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اب زمین صاحب کی اخلاقی فکر شعر سے لطف لیجئے۔

در پیر مغاں پر ہے یہ کتبہ گیا خوش کام جو ناکام آیا
یہ دیکھا مہد سے لیکر لحد تک گئیں بے چینیاں آرام آیا

○

نکل سکے نہ کبھی دشمنوں کے دل سے بھی
یہ دوستوں کو پتہ ہے کہاں کہاں ہیں ہم
زمین ہم ہیں ازل سے غبار کوئے حبیب
یہی سبب ہے کہ مسجود قدسیاں ہیں ہم

○

خلوص عشق سزا و جزا سے مستغنی
نہ ثواب کی امید بھی گناہ کہیں
جہان دیدہ و دل کیوں نہیں ہیں ایک زمین
ترا خیال کہیں ہے تری نگاہ کہیں

○

تمہارا ذکر کیا ہم نے تمہارے پانے والو کو
حدود امتیاز کفرو ایماں سے ادھر پایا

○

جنہیں غرور ہے اس بے ثبات ہستی پر
انہیں کو بے سرو سامان جانتا ہوں میں

○

حرم و دیر تہی دامن ہیں ہاتھ انسان کہاں سے آئے
حسن ہر آن نئی شان میں ہے جان پہچان کہاں سے آئے
شہیدان وفا کی خاک سے آواز آتی ہے
یہ ذرے کوئے جاناں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں
محبت ہم کو منہ دیکھے کی پھولوں سے نہیں گلچیں
خزاں میں ہم گلستاں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

یہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھولوں کی بہاریں
جو پھیل گئیں دامن گلچیں سے سبد تک

○

کئے ہم نے جتنوں سے نکتہ چین و نکتہ داں پیدا
ہم ایسے آدمی دنیا میں ہوتے ہیں کہاں پیدا
ہزاروں بدگمانی حسن سے اہل ہوس کو ہیں
محبت نے کیا ہے حسن سے حسن گماں پیدا
سمجھ ہو تو وہاں پھر کیوں بنائے آشیاں کوئی
جہاں بجلی کی قسمت سے ہو شاخ آشیاں پیدا

○

کبھی انسان سے انسان محبت نہ کرے
ہاں محبت نہیں آسان محبت نہ کرے
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل کوئی
کھیل سمجھا ہے جو طوفان محبت نہ کرے

○

زباں پہ عہد وفا ہے نظر میں عزم جفا
مجاز اپنی حقیقت سے آہ کیوں نہ ملا

رندانہ

شاعری کو کلام موزوں میں مقید سمجھنا غلطی ہے، ہوسکتا ہے کہ کلام موزوں ہو مگر اس پر شعر کا اطلاق نہ ہوسکے مثلاً:

خالق باری سرجن ہار واحد ایک بدا کرتار
رسول پیمبر جان بیٹھ یار دوست بولی جا اٹھ

باوجودیکہ اس کلام میں نظم عروضی موجود ہے مگر اس کلام کو بمشکل بھی شعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں شعر کی شرائط موجود نہیں ہیں اور اس کا مخاطب غیر ہے اور نہ

ایک تعلیم ہے اور اس کے لئے نظم سے نثر میں کلام کہیں زیادہ مناسب ہے شعر کی شرائط کے ساتھ جب رندانہ شاعری کا جائزہ لیا جائے گا تو علامہ شبلی کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرنا پڑے گا کہ

"شاعری میں تصوف کے آنے کا دن شاعری کی صبح نوروزی تھا"۔

شاعری جذبات کا نام ہے ریاضیات اور علوم حکمیہ جذبات کے دائرے سے خارج ہیں اور صاحبان حال صوفی شعراء کے اشعار سراپا جذبات ہی جذبات ہوتے ہیں اس لئے صوفیانہ شاعری نہایت جوشیلی اور پر تاثیر ہوتی ہے صوفی شعراء نے عاشق و معشوق کی حیثیت ذاتی کی کایا پلٹ کردی ان کی زبان پر عالم مجاز سے جو لفظ بھی آیا' حقیقت کا ترجمان آیا اس سے متغزلانہ مضامین کے ساتھ' رندانہ شاعری کی بھی قسمت کھل گئی شراب و ساقی کا جو کچھ مفہوم ہمارے سماج میں سمجھا جاتا ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے مگر شراب و ساقی کو حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ کے مندرجہ ذیل شعر میں دیکھئے۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

تو شریعت حقائق کا ایک فتویٰ معلوم ہوتا ہے۔

ذہین صاحب کی شاعری میں بھی رندانہ مضامین کا یہی حال ہے بعض اشعار نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں:۔

پڑھ رہا تھا کل تک جو زہد کا مقالہ شیخ — ہوگیا ہے رندوں کا آج ہم پیالہ شیخ
اس طرف گیا واعظ شیخ اس طرف آیا — بن گیا حقیقت میں شاخ کا امالہ شیخ
میکدے میں آتے ہی آگئے تمام آداب — پی رہا ہے ساقی کے جام کا غسالہ شیخ
دعوت گزک رد ہو یہ گناہ شرعی ہے — احتیاط تقویٰ ہے ایک دو نوالہ شیخ
فتح عذر مستی نے پائی عذر شرعی پر — کرسکا نہ رندوں سے حیلہ و حوالہ شیخ
لے زمین سے کوئی جام آتش تر لے
آگ اور پانی کا دیکھ استحالہ شیخ

○

ازروئے شرع روئے حسیں پر نظر مباح — لیکن وہی نظر نہیں بار دگر مباح
پائے صنم پہ سجدہ بتاتے ہیں جو حرام — ان کے لئے پرستش دیوار و در مباح

کہتے تھے جو حرام ہے مستی و بے خودی
کہنے لگے ہیں وہ بھی تجھے دیکھ کر مباح
ہوتی ہے میکدے میں نماز سحر ادا — پھر بن گیا ہے نغمہ قلقل اذان صبح
پینے لگے شراب میں پھر نور گھول کر — شیخ حرم ہیں دہر میں پیر مغان صبح
مرد پیر مغاں فخر میکشی ہے وہی — جو کرسکے غم ہستی کو غرق جام شراب
عشق میں دیدہ و دل شیشہ و پیمانہ بنا
جھوم کر بیٹھ گئے ہم وہیں میخانہ بنا
خیر سے دھوم ہے میخانے میں — ہم مسلمان کہاں سے آئے

وحدۃ الوجود

فلسفے کا بنیادی مسئلہ وحدۃ الوجود ہے۔ شاعری' خصوصاً اردو شاعری میں جس کی عمر نہایت کم ہے یہ فلسفہ کافی پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں کم و بیش وحدۃ الوجود کے خیالات ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں مگر جیسے جیسے اردو شاعری کی عمر بڑھتی گئی وحدۃ الوجود کا فلسفہ اس میں زیادہ داخل ہوتا چلا گیا چنانچہ سب سے پہلے یہ مسئلہ کھل کر جس شاعر کے کلام میں سامنے آیا وہ حضرت شاہ نیاز احمدؒ ہیں۔ آپ کے بعد فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی اور میکش اکبر آبادی کے کلام میں اس کی نمود ظاہر ہے مگر میکش صاحب کے کلام میں زیادہ شدت سے پایا جاتا ہے اور کھلا ہوا بھی نہیں ہے۔ وہ وحدۃ الوجود کے مسئلے کو پردہ در پردہ بیان کرتے ہیں۔ بہت کم کھلا ہوا تصوف ان کے کلام میں ملتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام کی تاثیر اسی حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میکش صاحب نے اصل حقیقت کے بیان میں مجاز کو ذریعہ بنایا ہے تو بے جا نہ ہوگا لیکن ان کا مجاز ہی حقیقت کا بہترین ترجمان ہے۔ اس باب میں جناب میکش بڑے صاحب طرز شاعر ہیں۔

ذہین صاحب کا تغزل بھی تصوف یا وحدۃ الوجود ہے۔ وہ بے پردہ اور خشک انداز میں بھی کہیں کہیں وحدۃ الوجود کہہ جاتے ہیں مگر اس کا وہی حصہ دراصل جاذب دل و دماغ ہوتا ہے جس میں شاعرانہ انداز بیان کا غلبہ پایا جاتا ہے۔

یہاں "وحدۃ الوجود" کے خشک موضوع کی تعریف کرکے مبادی مسلمات سے بحث

کرنے کی بجائے اس حصے کو پیش کیا جاتا ہے جو جاذبیت میں جادو کا سا اثر رکھتا ہے اور ذ مین صاحب کے کلام میں نہایت دل کش انداز سے پایا جاتا ہے۔ وحدۃ الوجود کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بقول علامہ شبلی اگر وحدۃ الوجود کے بیان کرنے میں احتیاط نہ کی جائے تو اس کے ڈانڈے الحاد سے ملتے ہیں۔ فلسفہ وحدۃ الوجود ذ مین صاحب کے کلام میں اس انداز سے پایا جاتا ہے کہ اس کے تمام مقامات اور وجود مطلق کے تمام تعینات اس سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اب فلسفے کی اس شاخ کا ذکر ضروری ہے جو فلسفے ہی کا ایک ذیلی موضوع ہے۔

نفسیات

اگرچہ ولی گجراتی ہی کے زمانے سے نفسیات کا موضوع اردو شاعری کا ایک جزو ہے تاہم میر تقی میر نے نفسیات کو اپنی شاعری میں اس طرح پرورش کیا کہ سوائے بالغ نظر ناقدین کے کوئی اسے نہ سمجھا۔ مومن دہلوی نے اس پر خاص توجہ کی۔ غالب نے اس کو معراج کمال پر پہنچایا۔ فانی اور حسرت موہانی نے اس میں عمق اور وسعت پیدا کی۔ رئیس المتغزلین جگر مراد آبادی کی غزل کی روح یا جان یہی نفسیات ہے۔ جگر کے بعد نفسیات کو عام اردو شعراء نے اپنا لیا اور آج کی غزل کی مقبولیت اور اثر اسی نفسیات کا نتیجہ ہے۔ ذ مین صاحب کی غزل میں نفسیاتی بجلیوں کی ایسی چکاچوند ہے کہ ادراک کی آنکھیں چندھیائی جاتی ہیں۔ جگر کی لطافت، فانی اور حسرت کی وسعت ذ مین کی غزل میں ایک مرکز پر نظر آتی ہیں۔ اس جامعیت نے انہیں ایک صاحب طرز شاعر بنانے میں کافی حصہ لیا ہے۔ ان کی غزل میں نفسیات کی جھلکیاں اس طرح پائی جاتی ہیں جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعر تحت الشعوری طور پر کوئی بات کہہ رہا ہے۔ ہر مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے سوچ سمجھ کر نہیں کہا ہے بلکہ اس کے تحت الشعور میں کوئی چیز تھی جو لاشعور کے تحت الفاظ کے سلسلے میں اپنے آپ آ گئی ہے (اور یہ نفسیات کا بڑا کمال ہے) اس سے ذ مین صاحب کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے۔

مقام زیر جائزہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ حسرت، فانی اور جگر کی غزلوں سے مقابلہ کر کے ذ مین صاحب کی نفسیات کو ممتاز کر کے دکھایا جاتا کیونکہ باعتبار واقعہ یہ امتیاز اہل نظر

سے پوشیدہ نہیں ہے مگر وقت اور جگہ کا سوال ہے جو عنقا ہیں۔ بہر حال ذ مین صاحب کے کلام میں نفسیات کا حال ذیل کے چند شعروں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ شاعری جہاں تک شاعرانہ اعتبار سے اس موضوع کی متحمل ہو سکتی ہے اس کے واضح نشانات ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

وہ آئیں تو بھی چین نہیں وہ جائیں تو بھی چین نہیں
اس دل کی یہ باتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

○

اس انداز سے وہ چھپے جا رہے ہیں — مرے سامنے جیسے آنا ہی چاہیں
بظاہر وہ تسکین فرما رہے ہیں — مگر اور کچھ کہہ رہی ہیں نگاہیں

○

جہاں جو شئے تھی وہیں رہ گئی وہ جب آئے
حجاب جا نہ سکا ہوش دید آ نہ سکا

○

من و تو سے حقیقت ماورا ہے — نہ تم تم ہو حقیقت میں نہ ہم ہم

○

خطاب اوروں سے اس انداز میں ہے — وہ جیسے مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں

○

میں نہ کہتا تھا کہ حال عشق ہے ناگفتنی
نکتہ چیں غم خوار کیوں ہے نکتہ داں ہونے کے بعد

○

کہیں نقاب نہ اٹھے خوشی کے چہرے سے
یہاں جو خوش نظر آتے ہیں غم کے مارے ہیں

○

ان کے آتے ہی کیا ہوا دل کو
دل میں کیا اضطراب تھا ہی نہیں

BZSTRFT

ہم اہتمام جلوہ گری میں شریک ہیں
زیرِ نظر ہماری نظر ہے نقاب میں

○

مصلحت حسن کو بیگانہ بنا دیتی ہے
یہ ادا عشق کو دیوانہ بنا دیتی ہے

ذو معنی اشعار

حالی نے غالب کی خصوصیات کلام میں ثابت کیا ہے کہ غالب کے بعض اشعار میں دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک معنی فوراً ذہن میں متبادر ہوتے ہیں اور دوسرے معنی ذرا غور سے سمجھ میں آتے ہیں۔ غالب کے کلام سے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

○

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردِ افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ذمین صاحب غزلیہ شاعری میں کسی کے مقلد یا نقال نہیں۔ اس لئے آپ کے کلام میں تقلیدی نمونے نہیں ملتے مگر چونکہ کنایہ کا خاصہ ہے کہ اس سے ذو معنویت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے ذمین صاحب کی شاعری میں بھی ذو معنی اشعار ملتے ہیں۔ غالب اور ذمین صاحب میں فرق اتنا ہے کہ غالب ذو معنویت کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں اور ذمین صاحب کے شعر میں کوئی برجستہ قرینہ ایسا آجاتا ہے جس سے ذو معنویت خود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ موجودہ دور کے لوگ ایسے اشعار کو "پہلودار" کہتے ہیں۔ پہلودار کا لفظ "ذو معنی" کا مفہوم ادا کرسکنے سے قاصر ہے۔ ذمین صاحب کے ذو معنی چند اشعار پیش ہیں:-

کہوں دوست سے دوست کی بات کیا کیا
رہی دشمنوں سے ملاقات کیا کیا

○

تری محفل میں ہر شئے دیدنی ہے   اگر ہے دیکھنے والا نہیں ہے
نگاہ عشق ہو یا پردۂ حسن   شریک جلوۂ زیبا نہیں ہے

○

تجھے کچھ کرامات اپنی دکھائیں
ترے دل میں ہم غیر بن کر سمائیں

○

بنانے کو اپنا بنا کر دکھائیں   ہمارا ہی پردہ ہمیں کیوں اٹھائیں

○

نوید قرب ہے میرے لیے مجھ سے گریز ان کا
وہ بیگانہ نگاہی سے مجھے اپنائے جاتے ہیں

جامعیت

جامعیت سے میری مراد ہے تغزل میں حقیقت و مجاز کا جمع ہونا۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ علامہ شبلی مرحوم نے بلبل شیراز حضرت حافظ علیہ الرحمۃ کی شاعری کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا مستفاد یہ ہے کہ حافظ کے کلام میں اعلیٰ درجے کا تغزل پایا جاتا ہے لوگوں نے انھیں زبردستی صوفی شاعر بنا کر ان کی قدر و قیمت گھٹا دی۔

علمی تجربہ اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ عرفی اور نظیری سے بڑھ کر کون غزل کہہ سکتا ہے۔ ان کا شمار صوفی شعراء میں نہیں ہوتا۔ تین چار صدیوں کے بعد بھی صرف خواجہ حافظؒ ازلی ہی ایسے شاعر ہیں جو عرفی و نظیری پر چھا جاتے ہیں اور بوالہوسی کی گرم بازاری شاعری کو پنپنے نہیں دیتے۔ یہ کیا ہے؟ یہ خواجہ حافظ کا زور تغزل ہی ہے مگر شبلی کی رائے کا منشا یہ نہیں ہے۔ حافظ کے کلام میں مجاز کے علاوہ کچھ نہیں ہے بلکہ ان کی مراد خواجہ حافظ کے تغزل کو سراہنا اور اچھی طرح سراہنا ہے تاکہ اس سے حافظؒ کی غزل وہ مقام حاصل کرلے جو باعتبار واقعہ اسے حاصل ہے اور یہ مقام جامعیت کے بغیر ناممکن ہے ورنہ خواجہ حافظ وہ شاعر ہیں جن کی وجہ سے غزل میں تصوف کی بجلیاں شامل

ہوئیں۔

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ذہین صاحب کے کلام کی جامعیت ان کو تمام صوفی اور غزل گو شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ بعض مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

جامعیت کی پہلی مثال

دل تری انجمن ناز میں کس طرح جلا
شمع اس راز سے واقف ہے نہ پراونہ ہے

خالص کیفیت مجاز کا اظہار ہے محبوب عاشق کو اپنی محفل میں بلاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ازراہ فیاضی و عاشق نوازی' عاشق کی ایک تمنا پوری کر رہا ہے اس کی ایک حسرت نکال رہا ہے یا اس کا ایک ارمان پورا کر چکا ہے بزم کے اختتام میں معشوق عاشق پر احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے:

کہئے! آپ آج تو بہت خوش ہوں گے ہم نے اپنی انجمن میں آپ کو شریک کر لیا۔

عاشق جواب دیتا ہے: آپ کی بزم میں مجھ پر جو بیتی اس کا حال یہ ہے کہ میں اندر ہی اندر اس طرح سلگتا رہا اور اس طرح جلتا رہا اس جلنے سے نہ تو پروانہ واقف ہے جو دوسرے کی آگ میں جلتا ہے نہ شمع کو اس کی کچھ خبر ہے جو اپنی آگ میں آپ جلتی ہے۔

ظاہر ہے کہ عاشق کو بزم محبوب میں جو حالات پیش آئے بیان کئے ہیں۔ حالات مطابق واقعہ ہیں ان میں تاثیر بھی ہے انداز بیان اور کلمات سے جملے کی ترتیب کا شعر کی صورت اختیار کرنا' عبارت کا فصیح ہونا اور انداز بیان کی بلاغت یہ وہ اسباب ہیں جو احساس مجازی کا پتہ دیتے ہیں اور شعر عشق مجازی کے بیان کا پسندیدہ نمونہ بن گیا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اگر بالفرض ایسا ہے بھی تو اسی کے ساتھ ساتھ

بشنو از نے چوں حکایت میکند وز جدائی ہا شکایت میکند
کز نیستاں تامرا ببیدہ اند از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

کا بھی مصداق ہے "تیری انجمن ناز" میں جو ضمیر ہے اہل تصوف میں اس کی تعبیر بقول صاحب "گلشن راز" یہ ہے:-

چہ ہست مطلق آمد در اشارت بلفظ من کند از وے عبارت

(یعنی) "میں تو اور وہ تعبیراً ایک ذات مطلق کی طرف اشارت ہیں" یہ تمام کائنات جو ازل سے ابد تک موجود ہے جب تک اس کا وجود ہے یہ ایک صوفی شاعر کی نظر میں حسن کی انجمن ہے حسن عاشق بھی ہے اور معشوق بھی اور ان کو رشتے میں منسلک کرنے والا عشق بھی ہے اس انجمن ناز کی یہ حیثیت عاشق کے نزدیک یعنی عارف کے نزدیک وہمی نہیں ہے بلکہ واقعی ہے ایک حسن مطلق اور جمال مجرد ہے کہ ان گنت تجلیوں میں متجلی ہے تجلیوں کی حقیقت وہی ہے جو مولانائے رومیؒ نے بیان کی ضمیر "تیری" کا مفہوم اور تجلیات کا منشا انجمن ناز کی قلب ماہیت کر دیتے ہیں "تیری انجمن" کی ایک صوفیانہ حقیقت اور بھی ہے:-

بلبلے برگ گل خوش رنگ در منقار داشت
وندراں برگ و نواصد نالہ ھائے زار دشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق در ایں کار داشت

(حافظ)

آیات جمال

گر ترے دل میں ہے خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

(غالب)

حضرت حافظ کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بلبل بے تحاشہ کلیجہ پھاڑ کر بے قراری کے ساتھ ایسی حالت میں فریاد کر رہا تھا جبکہ اسے اپنے محبوب (پھول) کا وصال حاصل تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر جب اس سے پوچھا گیا کہ وصل میں نالہ و فریاد کا کیا سبب ہے تو بلبل نے جواب دیا: "وصال محبوب نے مجھے یہی عطا کیا ہے"۔

غالب فرماتے ہیں کہ لوگو! اس فریب میں نہ آجانا کہ وصال کیفیت عشقیہ کو ضائع

BZSTRFT

کردیتا ہے پانی اور اس کی موج کا وصال دیکھو مگر عین حالت وصال میں بھی اس کی عشقیہ کیفیت یعنی بیقراری زائل نہیں ہوتی۔

زمین صاحب کے شعر میں ہر جت اس انداز سے ثابت ہے کہ شعر کا مصداق صحیح حقیقت کو سمجھے بغیر قرار ہی نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری مثال :-

جلوہ ترا سو بار بھی دیکھا تو یہ دیکھا
اب دیکھ رہا ہوں کبھی دیکھا ہی نہیں ہے

سیدھا سادا شعر ہے خالص مجاز سے تعلق رکھتا ہے شاعرانہ اعتبار سے یہ شعر ایسا ہے کہ سنتے ہی طبیعت حظ حاصل کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر نہایت آسانی سے کہہ لیا گیا ہے اور ایسے شعر نہایت آسانی سے کہے جاسکتے ہیں تشبیہ ہے نہ استعارہ' نہایت مطبوع انداز بیان ہے اور فارسی میں یہ مضمون نیا نہیں ہے کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً

وفور جلوہ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
(اصغر)

(یا) :- می نماید یار من ہر دم تجلائے دگر
(وغیرہ)

ایسے شعر کہنا آسان ہی ہے بشرطیکہ شاعر صاحب معاملہ ہو مگر صاحب معاملہ ہونا آسان کام نہیں ہے استاد ذوق کے حلات میں نظر سے گزرا ہے کہ چند معاصرین کے ساتھ میر کی ایک زمین میں فکر کر رہے تھے اور چونکہ "چاک" کا قافیہ التزام کے ساتھ نظم کرنے کی شرط تھی اس زمین میں میر کا شعر نہایت گرم اور چست ہو گیا تھا:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

عین اس حالت میں جب استاد ذوق "چاک" قافیے پر غور کر رہے تھے کسی نے دریافت کیا' استاد کیا کر رہے ہیں؟ تو استاد ذوق نے جواب دیا:

قل ھو اللہ احد

کا جواب لکھ رہا ہوں۔ زمین صاحب کے متذکرہ بالا شعر کی شرح کرنا "قل ھو اللہ احد" کے جواب سے کم نہیں ہے بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت مشکل ہے اسی طرح سہل اشعار کی تشریح بھی بے حد کٹھن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ یہ شعر آسان ہے نہ اس کی جامعیت کی توضیح۔ عاشق معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ "اگرچہ میں تجھے بے شمار مرتبہ دیکھ چکا ہوں مگر اس دیکھنے کا اب تک تجربہ یہ ہے کہ جیسے پہلے پہل اب دیکھ رہا ہوں اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا" یہ مضمون ایک نفسیاتی حقیقت ہی ہو سکتا ہے کہ ایک عاشق اپنے محبوب کو گھڑی گھڑی دیکھے اور ہر مرتبہ دیکھنے میں نئی لذت پائے اور ہر بار اسے اپنے محبوب کی تجلی فرط شق سے نئی معلوم ہو محبت کے نقطۂ نظر سے یہ حقیقت کچھ بعید نہیں ہے بلکہ عین مطابق حقیقت ہے اور نفسیاتی بھی۔

مگر یہی واقعہ جو حقیقت مجازی ہے ایک ایسے شخص کے وجدان میں ایک نئے روپ سے جلوہ گر ہوتا ہے جس کی نظر حسن مطلق کی مقید تجلیات سے ایک آن کے ہزارویں حصے کیلئے بھی نہیں ہٹتی اور وہ دیکھتا ہے کہ حسن ہر آن نئی شان میں جلوہ گر ہے اور ہر آن وہ جلوۂ نادیدہ کو دیکھ رہا ہے۔

تیسری مثال :-

محبت اب بھی محبت ہے حسن اب بھی حسن
ترا کرم ہے کہ پردہ اٹھا دیا تو نے

عاشق نے محبوب کو دیکھا نہیں تھا۔

بسا کاین دولت از گفتار خیزد

آخر وہ وقت بھی آیا کہ محبوب بے پردہ عاشق کے سامنے آگیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر عاشق کہتا ہے کہ میری محبت جیسی تیرے پردہ اٹھانے سے پہلے تھی اب بھی ویسی ہی ہے اور تیرا حسن بھی بے پردگی کے بعد میری نظر میں ایسا ہی ہے جیسا بے پردگی سے پہلے تھا۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق اپنی محبت میں سچا ہے عشق مجازی کے اعتبار سے یہ بڑی بات ہے اس شعر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مگر "تیرا کرم" کا مضاف الیہ ایسا ہے کہ شعر میں کسی قسم کا ردوبدل کئے بغیر مفہوم

بالکل بدل دیتا ہے۔ اب پردہ اٹھنے کے حقیقی معنی یہ ہوئے کہ عاشق جو محبت اور حسن کو ظہور کے اعتبار سے دو متغایر چیزیں سمجھ رہا تھا وہ حقیقت کے اعتبار سے باہم نہ متغایر ہیں نہ متضاد' ایک ہی وجود ہے کہ جو دو صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وہی عشق ہے اور وہی حسن۔ یقین کے پردے اٹھ جانے کے بعد اعتبار غیریت باقی نہیں رہتا اور ہر شئے اپنی ہیئت کذائی پر رہتے ہوئے اپنی وہ حیثیت کھو بیٹھتی ہے جو حواس ظاہری سے تعلق رکھتی ہے۔

اردو شاعری میں ذہین صاحب کا مقام

ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات کا مختصر طور پر ایک اشارتی خاکہ پیش کیا گیا۔ نازک خیالی' لطافت' احساس ندرت' جذبات اور نغمگی وغیرہ چند ایسی خصوصیات ابھی باقی ہیں جن پر روشنی ڈالنا ضروری تھا مگر چونکہ یہ عام اوصاف ہیں اس لئے انہیں عدیم الفرصتی کے احترام میں ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔

جگر مراد آبادی نے استاد داغ کے بعد غزل کو یہی نہیں کہ دوبارہ زندہ کیا بلکہ اسے حیات نو بخشی۔ ذہین صاحب نے اسی غزل کو صحت مند بنایا۔ اس میں سے متوحش اور نامطبوع مضامین کو دور کیا جس سے اس کی دل آویزی اور ہر دل عزیزی بڑھ گئی۔ میں نے غزل گو شعراء کے سلسلے میں بعض شعراء کے نام دور حاضرہ کے لحاظ سے پیش کئے ہیں مگر ذہین صاحب کے کلام کا تفصیلی جائزہ خصوصیت سے ان کی غزل پر غور کرنے سے ہی لیا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ جیسا کہ دنیا کی ہر زبان اپنے قواعد صرفیہ و نحویہ سے محفوظ رہتی ہے اور کلام میں دوسرے علوم دلیل کے طور پر کام آتے ہیں میں نے صرف و نحو کے ساتھ علوم معانی و بیان سے استدلال کیا ہے اور اپنے بوتے بھر فلسفے کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اس کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں ذہین صاحب کی غزل میں تمدن و معاشرت اقتصادیات و سیاسیات کے موضوع سے بحث نہیں کی گئی ہے ورنہ تقسیم ملک اور اس کے اثرات غزل پر ذہین صاحب کے یہاں متغزلانہ انداز میں نہایت حسن و لطافت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

بدیہہ گوئی میں امتیاز

ذہین صاحب کی زندگی سے بعض ایسے متفرق شاعرانہ حالات وابستہ ہیں جو یہ ثابت کرنے میں مدد دیتے ہیں کہ غزل گوئی اور مطلقاً" شاعری میں وہ ایسی خصوصیات کے مالک ہیں جو متقدمین اور معاصرین سے بالکل مختلف ہیں۔ غالب کی "چکنی ڈلی" کا مشہور واقعہ ہے۔ ذہین صاحب کے ساتھ بھی ایسے ہی چند واقعات میری نظر سے گزرے ہیں۔ جے پور (راجپوتانہ) کا ذکر ہے غالباً یہ ۱۹۴۳ء یا آس پاس کا دور ہے۔ برخوردار الیاس عشقی سلمہ الرحمٰن بی۔اے کے کسی سال میں تھے۔ ان کے احباب شعر کا حلقہ وسیع تھا۔ رائل ہوٹل رام گنج بازار میں ہفتہ وار صحبت شعر کا انعقاد ہوتا تھا۔ ایک بار اس نوجوان طبقہ شعراء نے یہ طے کیا کہ ہمارے پیشرو شعراء چونکہ طرحی مشاعروں میں اپنی برتری عملاً ثابت کردیتے ہیں لہٰذا مصرع طرح کی جگہ شعر کے لئے کوئی عنوان تجویز کیا جائے چنانچہ باہمی بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ اس مرتبہ نظم کا عنوان "حسن آوارہ" مقرر کیا جائے۔

یہ تجویز ابھی طے ہی پائی تھی کہ اتفاق سے ذہین صاحب چلتے پھرتے ادھر بھی آنکلے اور جیسے ہی نظم کے لئے عنوان کی تجویز سنی' حاضرین میں سے کسی سے کاغذ طلب کیا۔ کاغذ قلم فوراً پیش خدمت کردیا گیا۔ مجوزین موضوع نے جو یہ دیکھا کہ ذہین صاحب کچھ لکھنے میں مشغول ہیں تو لوگ چائے کے انتظام میں مصروف ہوگئے۔ جب چائے سامنے آئی تو ذہین صاحب نے قلم روک لیا اور پوچھا کہ مشاعرہ کب ہے؟ جواب ملا کہ کل شب کو۔ فرمایا ہماری طرف سے یہ نظم معیاری نہیں ہوگی تو مقررہ جرمانے کے کباب ہم پیش کریں گے۔ یہ کہہ کے انہوں نے چائے پی اور چلے گئے لیکن اس نظم کو جب پڑھا گیا تو نہایت معیاری اور پر مغز نظم نکلی (یہ نظم آپ ذہین صاحب کی نظموں کے مجموعے میں ملاحظہ فرمائیں گے)

اسی طرح ایک مرتبہ جے پور میں جناب مولوی سید انوار الرحمٰن بسمل کے دولت کدے (میرجی کا باغ) پر چند احباب دوپہر کے کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ شعر کا تذکرہ چھڑ گیا باتوں ہی باتوں میں معاملہ یہ طے ہوا کہ فی البدیہہ طبع آزمائی

کی جائے میں اس لطف کو کبھی نہیں بھلا سکتا کہ جب ایک دوست کوئی مصرع شعر کہنے کے لئے تجویز کرتا تھا تو دوسرے احباب اس کی ناپسندیدگی پر استدلال کرتے اس استدلال میں جو شاعرانہ اور فنی نکتہ نجیاں ہوتی تھیں آج ان سے کون لطف اندوز ہو اسی اثناء میں حضرت بسمل کی صاحبزادی نے انہیں زنان خانے میں بلایا اور کہا اگر قبول ہو تو فکر شعر کے لئے ایک مصرع پیش کرتی ہوں یہ کہہ کر انہوں نے حضرت بسمل علیہ الرحمۃ کو غالب کے ایک شعر کا مصرع اولیٰ طرح کے لئے نذر کیا جو یہ تھا :

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی

اس مصرع کا پہنچنا تھا کہ اعتراضات اور مباحثے کا سلسلہ ختم ہوگیا پندرہ منٹ کی مہلت دی گئی ذہین صاحب نے اتنے سے وقت میں جو غزل کہی تھی اس مجموعے میں شریک ہے۔(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۶)

ایک واقعہ اور سنئے۔ شاید ۶۰ء کی بات ہے کراچی میں ذہین صاحب اور میں ماہنامہ فاران کے دفتر جا نکلے جناب ماہر القادری تشریف فرما تھے میرے مخلص اور چیدہ احباب میں سے ہیں ان کی ملاقات ذہین صاحب سے سرسری تھی انہوں نے ذہین صاحب سے تازہ کلام کی فرمائش کی ذہین نے اسی وقت کاغذ میز سے اٹھایا اور ایک غزل لکھ کر ماہر صاحب کے حوالے کی میں ذہین صاحب کی اداؤں کو سمجھتا ہوں میں نے ماہر صاحب سے کہا کہ یہ آپ کی فرمائش کی صحیح تعمیل ہے یہ غزل ابھی نوا آشنا تک نہیں ہوئی ہے ماہر صاحب نے اس فی البدیہہ گوئی پر سخت حیرت کا اظہار کیا اور غزل کے اشعار بار بار پڑھ کر مجھے سناتے رہے وہ غزل فاران میں شائع ہو چکی ہے۔ ذہین صاحب کی زود گوئی اور بدیہہ گوئی کے مجھے بہت سے تجربے ہیں میں نے جگر مرحوم کی زود گوئی دیکھی جوش ملیح آبادی نہایت زود گو شاعر ہیں۔ جناب ماہر القادری بھی نہایت مشاق شاعر ہیں مگر ذہین کی زود گوئی میں' میں نے ایک فرق پایا وہ یہ ہے کہ معاصرین کے مقابلے میں ان کی زود گوئی میں بھی فکر و مشاہدے کی وہی خصوصیات قائم رہتی ہیں جو سوچ سمجھ کر غزل کہنے میں پائی جاتی ہیں یہ خصوصیت بھی ان کی انفرادیت کو ممتاز کرتی ہے۔

ذہین صاحب آج مسند فقر و ارشاد کے مالک ہیں ان کے دائرہ عقیدت میں بڑے بڑے فضلاء عصر داخل ہیں اور نعمت خلافت سے سرفراز ہیں عین اسی حالت میں صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ ایک نہایت بلند پایہ صاحب مذہب شاعر بھی ہیں آخر عمر میں اکثر و بیشتر

شعراء کا دم نکل جاتا ہے جگر کی مثال ہمارے سامنے ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ ذہین صاحب کی غزل آج بھی اعلیٰ درجے کی غزل ہے۔

فارسی گوئی : ذہین صاحب کی زبان نہایت شیریں اور صاف ہے خیال میں الجھن بالکل نہیں ہے نازک سے نازک خیال اور لطیف سے لطیف احساس کو بے تکلف فارسی زبان کا جامہ پہنا دیتے ہیں ان کے کلام میں غزل' رباعی' قطعہ' نظم' مثنوی وغیرہ سب ہی اصناف سخن پائی جاتی ہیں فارسی کلام آج کل زیر طباعت ہے فارسی کلام بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

نگاہ شوق کہ بر عارضش توان افتاد
بہ مہر و ماہ چو افتاد رائیگان افتاد
ز قعر ظرف دل عشق حرف وزدیدہ
چہ شورہا کہ ز ناقوس تا اذان افتاد
جنون سفینۂ نوح است و حسن چون طوفان
خرد چو خس کہ بگرداب این و آن افتاد
ز جلوہ ھاے تو نظارہ آشتی میداشت
نزاع زلف تو ناگاہ درمیاں افتاد
بگوش غیرت حسنت دل رمیدہ بگفت
کہ صید تست و بفتراک دیگراں افتاد
ذہین تا دل ما از کنار ما رفتہ
سفینہ ایست کہ در بحر بیکران افتاد

معائب کلام : اگرچہ اصولاً ذہین صاحب کے کلام کے محاسن اور خصوصیات کے بیان میں جہاں میں نے ضروری تشریح سے کام لیا ہے وہاں میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان کا کلام عیوب و اسقام سے بری ہے یقیناً ذہین صاحب کے کلام میں بعض معائب کلام بھی پائے جاتے ہیں مثلاً (غرابت) اس سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسے فارسی یا عربی لفظ کا استعمال کلام میں کیا جائے جو اردو روزمرہ کے خلاف ہو مثلاً اس شعر میں لفظ "اسم" غریب ہے۔

تمہارا جسم مری جان ہوگیا جب سے

تمہارے اسم ہی کو جان جاناں ہوں میں

اردو میں اس مقام پر "اسم" کی جگہ "نام" بولیں گے۔

ٹھیٹ عربی یا فارسی کے الفاظ کا استعمال ترکیب اضافی کے ساتھ غرابت کو کھودیتا ہے عربی الفاظ پر ہی موقوف نہیں بعض ہندی الفاظ بھی بے محل استعمال سے غرابت اختیار کرلیتے ہیں مثلاً اس شعر میں لفظ "ڈگر"

ذہین سوئے کمیں گاہ دیکھتا ہوں میں
اسی ڈگر سے مرے مہرباں گزرتے ہیں

ذہین صاحب کے اردو کلام میں ایسی قابل نظر باتیں دیکھنے میں آتی ہیں جو مناقب وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً

صاحب معراج تاج الانبیاء کے قرب میں
دو کماں قوسین دو ابروے تاج الاولیاء

شعر مرقومہ بالا میں "قوسین" سے مراد دو کمانیں ہیں اس شعر میں دو کمانیں دو قوس اور دو ابرو' الفاظ جمع ہیں قوسین اور دو کماں میں سے ایک لفظ ضروری معلوم ہوتا ہے اور دوسرا زائد۔

ایسے معائب بزرگوں کے کلام میں عام ہیں یہ حضرات معنی کو الفاظ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں مگر یہ اصول بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ معائب کی مثالیں بھی ہمیشہ اساتذہ ہی کے کلام سے اخذ کی جاتی ہیں۔

بعض خال خال اور بھی کمیاں ذہین صاحب کے کلام میں ہیں مثلاً ضعف تالیف اعلان نون تکرار حرف قافیہ وغیرہ مگر یہ عیوب محض عیوب کی مثال میں نظر آتے ہیں ان کی حیثیت کلام میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی آٹے میں نمک کاش مجھے مہلت ملی ہوتی تو اپنی عبارت کی کمیاں بھی دیکھ لیتا اور دوسرے اچھوتے اور ایسے مضامین کا اضافہ کرسکتا' جو حضرت ذہین شاہ تاجی کے کلام کی خصوصیت ہیں۔

(مولانا محمد اسماعیل خاں صاحب رزمی کراچی ۱۳ر نومبر ۱۹۶۶ء ش)

نوٹ : مقدمہ کا خلاصہ شریک اشاعت ہے پورا مقدمہ مرآۃ میں شائع ہوچکا ہے جو آیات جمال پہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ آیات جمال میں اسم نہیں بلکہ جسم چھپا ہے۔ (ادارہ)

آیاتِ جمال

ذہین شاہ تاجی

BZSTRFT

تعارف

جب کبھی میں اپنی عمرِ رفتہ کو مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ؛ وہ لمحہ ہوتا ہے، جو مُمتد ہو کر نصف صدی میں پھیلے ہوئے لمحات پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہو کہ ماضی کے پچاس سال کو حال کا ایک لمحہ اپنی آغوش میں سما لیتا ہے۔ وسعتِ زمانی آنِ واحد میں سمٹ آتی ہے۔

کوئی پینسٹھ ۶۵ سال پہلے مَیں ایک نومولود کی حیثیت سے دنیا میں آیا تھا۔ سات سال کی عمر میں قرآن ختم کیا اور گیارہ ۱۱ بارہ ۱۲ سال کی عمر تک فارسی کی معروف و متداول کتابیں پڑھیں۔ پھر علومِ دینیہ کا طالب ہوا، تو عمر ختم ہونے کو آئی، یہ طلب ختم نہ ہوئی۔ یُوں تو زندگی میں بہت سی منزلیں ایسی آئیں کہ تکمیلِ تحصیل کی۔ اَسناد نے مجھے فارغ التحصیل ہونے کا یقین دلایا اور کہنے والوں نے مجھے عالم فاضل، مولوی، مولانا، علّامہ، ادیب، شاعر اور نہ جانے کیا کیا خطابات دیئے۔ مگر علم کی پیاس نہ بُجھنی تھی نہ بُجھی۔ بلا تصنع آج پینسٹھ ۶۵ سال کی عمر میں بھی میں ویسا ہی طالبِ علم ہوں جیسا کہ سات سال کی عمر میں طالبِ علم تھا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اِس زمانۂ طالبِ علمی میں سے سات سال کم کر دیجیے تو باقی دن اِسی اُمید میں گزرے کہ یہ طلب کسی نہ کسی دن، بیافت پر ضرور مُنتج ہوگی اور وہ دن وہ ہوگا کہ میں علمی دُنیا میں کارگذاری کا خود کو اہل سمجھوں گا مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ اُمید کبھی بَر نہ آئی۔ ہنوز روزِ اوّل ہے۔

ما طفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سَر گرفتہ ایم

بمشکل نو سال کی عمر ہوگی کہ مَیں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شعر گوئی کا محرک وہ ماحول تھا جس میں مَیں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ والد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ جہاں علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے وہاں شاعری میں بھی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو میں بہت اچھے اشعار کہتے تھے۔ فراقیؔ تخلص فرماتے تھے۔ کریمائے سعدی کی تضمین فرمائی اور تاریخ تضمین یہ لکھی:۔

بحمد اللہ شد مرقوم و مسطور — بتضمینِ پند نامہ پند موفور
فراقی کرد تضمینِ کریما — بگفتا رُوحِ سعدی چشمِ بد دُور

پئے تاریخ بر نام محمدؐ ۹۲
مکرر گفتہ ام نورٌ علیٰ نور
۹۲۲

نورٌ علیٰ نور کے اعداد ۹۲۲ ہوتے ہیں۔ یہ اعداد مکرر ہوئے تو اِن کا مجموعہ ۱۸۴۴ ہوا۔ اِن میں اسمِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اعداد ۹۲ شامل کیے جائیں تو ۱۸۴۴+۹۲=۱۹۳۶ء ان کا مجموعہ ہوگا۔ ۱۳۳۶ ہجری سن جو سالِ تضمین ہے۔ یہ تضمین میری قلم سے ۱۳۳۶ھ ہی میں لکھی گئی تھی اور تاریخ تضمین بھی اسی وقت کی لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔ اور اس کا عکس شریکِ اشاعت ہے۔

۱۳۳۶ ہجری میں گویا آج سے پچاس سال پہلے میں نے اپنے جدِ بزرگوار کی تاریخِ وصال کہی تھی۔ وہ یہ ہے:۔

چوں معز الدین، جدم، رفت در دارُ المعاد
از سرِ آہ و بکاہ گفتا ذہین مغفور باد

"مغفور باد" کے اعداد ۱۳۳۳ ہوتے ہیں۔ ان میں آہ کے ۲ آلف ۱ اور بکا کی ب کا تعمیہ کر کے ۱۳۳۳+۱+۲=۱۳۳۶ھ حاصل کئے گئے تھے۔

ایک دفعہ غزل کے اشعار لکھتا جا رہا تھا اور گنگناتا جا رہا تھا کہ حضرت والد صاحب قبلہ اچانک تشریف لے آئے۔ مَیں نے غزل کو چھپا لیا، تو فرمایا کہ ایسا شعر کہتے ہی کیوں ہو جس کو چھپانے کی ضرورت پڑے۔ شعر ایسے کہنے چاہئیں جو ماں، باپ، بھائی، بہن، استاد، دوست احباب سب کو سُنائے جا سکیں۔ پھر فرمایا:۔

نوشتہ بماند سیہ بر سپید
نویسندہ را نیست فردا اُمید

اِس تنبیہہ کا اثر میری شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

نو دس سال کی عمر میں شعر و شاعری کا شعور ہی کیا ہوگا۔ مگر میں شعر کہنے لگا تھا۔ شعر گوئی کے محرکات میں طبعی مناسبت اور فطری ذوق کے بعد میں اپنے ماحول کو محرکِ اولیٰ قرار دے سکتا ہوں۔ وہ ماحول جس میں مَیں نے آنکھیں کھولیں، سب سے پہلے والدین کی آغوشِ عاطفت ہی تھا۔ یہی میری نشو و نما کا گہوارہ تھا۔ یہی میری تعلیم و تربیت کا مرکز تھا۔ والد صاحب اپنے مسودات تحریر صاف کرنے کے لیے مجھے دیتے تھے۔ آپ یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ میں اس کم سنی میں خوش نویس بھی مشہور تھا۔ یہ فن بھی مجھے والد صاحبؒ نے تعلیم کیا تھا۔

کتابتِ اشعار سے ذوقِ تحریر پیدا ہوا۔ پھر یہ کہ والد صاحب قبلہ رات کے اکثر حصّوں میں اثر انگیز لب و لہجے میں متقدمین کے اشعار پڑھتے تھے۔ اُن میں دُعائیں، مُناجاتیں، حمد و نعت و مناقب ہوتے تھے۔ مَیں پلنگ پر لیٹے لیٹے سُنتا، سمجھتا اور متاثر ہوتا تھا۔ غرضیکہ شب و روز شعر و سخن کی ایک مستقل فضا میرے دل و دماغ پر والد صاحب قبلہ کے فیضِ صحبت سے طاری تھی اور یہی میرے لئے مذاقِ سخن کی محرّک اوّلی تھی۔

دوسرا محرک ہمارا خاندانی ماحول تھا۔ ہمارا محلّہ پیر صاحبان کا محلّہ کہلاتا تھا۔ ہمارا خاندان ہزاروں نفوس پر مشتمل تھا۔ وہ سب اسی محلّے میں آباد تھے۔ محلّہ دُو حصّوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصّہ زنانہ تھا، دُوسرا مردانہ تھا۔ مردانہ حصّے میں نشستیں تھیں۔ ان میں اہلِ محلّہ جمع ہو کر بیٹھتے۔ بیشتر شعر و شاعری کے چرچے رہتے۔ محلّے کی مسجدوں میں وقتاً فوقتاً مجالسِ میلاد شریف منعقد ہوتیں اور ان میں بزرگوں کے ساتھ نوجوان میلاد خواں بھی ہوتے۔ یہ مجلسیں خوش آہنگی، بلند آہنگی اور ہم آہنگی میں جہاں بے مثل اور نادر تھیں، وہاں ہمارے خاندان کے نعت گو شعراء کی فنّی استعدادوں کی بھی مظہر ہوتی تھیں۔ محلّے کے زنانہ حصّے میں عورتیں نعت خوانی کا اہتمام اور التزام رکھتی تھیں۔ مَیں اور میرے ہم عمر بچے تقریباً روزانہ رات کو بعدِ نمازِ عشاء مقررہ جگہ پر جو پہلے سے سجائی جاتی تھی، جمع ہوتے اور مل جُل کر نعت پڑھتے۔ بچے اور عورتیں ہماری نعت خوانی کو بہت پسند کرتے۔ اس ماحول کا مجموعی طور پر یہ اثر ہوا کہ میں نے خود نعت کہنا شروع کر دیا۔

میرا نام محمد طاسین ہے۔ پہلے طاسین تخلّص کرتا تھا۔ والد مہربان نے پہلے پہل میرا کلام دیکھا تو تعریف کی اور فرمایا تم ذہین ہو۔ یہی تمہارا تخلّص ہے۔ اس زمانے کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ یاد کرنے سے ایک نعت کا مطلع یاد آیا۔ اس زمانے میں "ہوگا" کو "ہوویگا" بولتے تھے۔ وہی نظم ہوا:-

کون کس کا ہوویگا جب روزِ محشر ہوویگا   لیکن اپنا حامی وہ حق کا پیمبر ہوویگا

یہ قدیم اردو کا دَور تھا۔ اسی زبان میں نعتیں پڑھی جاتی تھیں، باتیں کی جاتی تھیں۔ یُوں بھی جھن جھنوں (شیخاواٹی)۔ راجپوتانہ کا وہ پسماندہ اور دُور افتادہ علاقہ تھا جو شہری آبادی سے کوسوں دُور تھا۔ جہاں نہ ریلیں تھیں، نہ موٹریں اور نہ سڑکیں۔ حمل و نقل کی دشواریوں نے اس علاقے کو بیرونی دنیا سے ہی نہیں، خاص جے پور سے بھی کاٹ رکھا تھا۔ شیخاواٹی کے پورے علاقے میں صرف ہمارا ہی ایک خاندان تھا، جو علم و فضل، شعر و سخن سے خود متصف تھا اور دُوسروں کی اس طرف رہنمائی کرتا تھا۔ اس خاندان میں بڑے بڑے عالم و فاضل حضرات بھی تھے اور صاحبانِ طریقت بھی تھے، خطیب بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، واعظ بھی تھے۔

بہر حال ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۶۶ء تک تقریباً پچاس سال کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس طویل مدّت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب کا سب ایک جگہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ "آیاتِ جمال" میں صرف اُردو غزلیات شائع ہو رہی ہیں۔ شاعری کے ابتدائی دَور میں، مَیں اپنے کلام میں شوکتِ الفاظ، فارسی تراکیب، تشبیہات و استعارات کا اہتمام مُبالغے کے ساتھ کرتا تھا۔ اس اہتمام کی تہ میں کچھ تو غالب پسندی اور کچھ خود پسندی شامل تھی۔ علم کی نمائش کا داعیہ بھی اس کا محرک ہوگا۔ مگر جس ماحول میں وہ شعر کہے اور سُنے جاتے تھے، وہ ماحول علمی تھا۔ وہاں بال کی کھال نکلتی تھی۔ ایک ایک جملے پر جرح اور تنقید ہوتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمانہ آگیا کہ اظہارِ مدّعا کے لیے آسان سے آسان تر زبان کا استعمال ضروری متصوّر ہوا۔ اس تبدیلی کی وجہ بھی تبدیلیٔ ماحول ہی تھی۔ وہ علمی صحبتیں مفقود ہو گئیں۔ سخن فہمی اور سخن شناسی نے حقائق کی بلندیوں سے تنزّل اختیار کیا۔ یہ تنزّلِ مجاز اور رسم کی حدود میں واقع ہوا۔ داد و تحسین رسمی سی چیز ہو کر رہ گئی اور کلام بھی جب تک دائرۂ مجاز میں نہ ہو اور معیارِ رسم پر پورا نہ اترے تو وہ خراجِ تحسین بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنی شاعری میں حقائق کو لباسِ مجاز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ردّ و قبول دونوں ہی مطمحِ نظر نہیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ مطمحِ نظر اہلِ رسم اور اہلِ حقائق دونوں پر ہی منکشف ہو جائے۔ کیونکہ دونوں کا حق مجھ پر مساوی ہے۔ میں مجاز اور حقیقت دونوں ہی سے اس عالم کو آباد دیکھتا ہوں جس میں میری سکونت ہے۔ مجاز بے حقیقت کی طرح حقیقت بے مجاز بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ امید ہے کہ قارئین "آیاتِ جمال" کا مطالعہ میرے مطمحِ نظر کی روشنی میں فرمائیں گے۔

آخر میں ایک بات اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ "آیاتِ جمال" کو اب سے بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر کیوں نہیں شائع ہوا؟ ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصف صدی کے طویل عرصے میں مجھے ان مسودات پر نظرِ ثانی کا وقت ہی نہیں ملا، جو میرے نزدیک محتاجِ نظرِ ثانی تھے اور اسی لیے میں انہیں ناقابلِ اشاعت سمجھتا رہا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ یعنی جس نے تصنیف کی وہ نشانہ بنا ــــ مگر رفتہ رفتہ زندگی اس منزل میں آگئی جہاں کسی کا تیر مجھے نہ لگے، خطا کرے، تو مجھے اس کی محرومی پر دکھ ہوتا ہے اور اگر تیر خطا نہ ہو، نشانہ پر لگے تو دل سے دُعا نکلتی ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ تجلّی میں تکرار نہیں ہے تو نظرِ ثانی یا نظرِ مکرّر کہاں۔

فقیر ذہین شاہ تاجی عفی عنہ

تاج منزل، کراچی
۲۲ر دسمبر ۱۹۶۶ء
۹ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ جمعرات

اضداد کی ہم آغوشی

کوئی تُک بھی ہے جناب والا، مجھ رندِ خراباتی اور حضرت ذہین شاہ تاجی کے مابین ارتباط و اختلاط کا۔۔ وہ غیب ہیں، میں شہُود، وہ ذکر ہیں، میں فکر، وہ معتقدِ "الہام" ہیں میں منکرِ پیغام، وہ دُرُود، میں عوُد، وہ حرَم، میں بیتُ الصنم، وہ محوِ نالۂ صبا حی، میں غرقِ دجلۂ صُراحی، وہ گریۂ شبانہ میں خندۂ سحرگاہانہ، وہ نقیبِ لا الٰہ، میں خطیبِ منبرِ گناہ ۔ وہ یقین کی گلی میں، بڑے اطمینان کے ساتھ دھونی رمائے، بیٹھے ہیں، میں تشکک کی وادیوں میں، یہ کہتا ہوا، خاک چھان رہا ہوں کہ :۔

صبا، بلطف بگو آن غزالِ رعنا کا
کہ سر، بکوہ وبیابان تو دادی ما را!

اُن کی آنکھوں میں رازیابی کا سُرور ہے، میرے دل میں تجسُّس کا ناسُور ہے، ان کو اپنے علم کا احساس ہے، میں اپنے جہل کا معترف اور ورد رہا ہوں کہ :۔ این ہا، ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست ۔ وہ گردن جھکاتے ہیں اور "جلوۂ یار" کو سامنے پاتے ہیں، میں، ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں کہ :۔

ساقی، مطرب و مے، جملہ مہیاست ولے
کیف بے یار میسّر نہ شود، یار کجاست ؟

وہ جب صُبح کے گلابی نُور میں آنکھیں اُٹھاتے ہیں، تو "شاہدِ غیب" کے جلووں

کے پھولوں سے ان کی نظر کا دامن بھر جاتا ہے اور "گُل چین بہارِ تو، زدامان گلہ دارد" کے ترانے چھڑ جاتے ہیں، اور میں نامُراد جب مُنھ اندھیرے جاگتا ہوں تو یہ شعر بے ساختہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے :۔

شب تار است و رہِ وادیٔ ایمن در پیش
آتشِ طور، کجا، وعدۂ دیدار کجا ست ؟

اور جب ، گُریز پا ستاروں پر نظر جاتا ہوں تو، گریبان پھاڑ کر چلاّتا ہوں :۔

اے ، رات گئے کے غم گُسارو، بولو | اے عالمِ بالا کے اشارو ، بولو
اس پردۂ رنگ و بُو میں پوشیدہ ہے کون؟ | بولو، اے ڈُوبتے ستارو، بولو

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مجھ میں اور ذہین شاہ میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے ؟ اسی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ شاہ صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ "نفسِ کُلی" اور حقائقِ کائنات کا ادراک ، وجدان ، اور فقط وجدان سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وجدان ایک ایسی طاقت ہے، جو فقط فنُونِ لطیفہ کی تخلیق و تزئین کے کام آتی ہے، تفتیش و تحقیق اس کا وظیفہ ہی نہیں۔ وہ ایک تفتیش کا پھندنا ہے۔ جس سے میدانِ جستجو، میں پھاوڑے کا کام لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس بناء پر میرا ایمان ہے کہ یہ صرف تفکُّر و تدبُّر ہے، جس کی چٹکی، لیلائے کائنات کے مُکھڑے سے نقاب اُٹھا سکتی ہے ۔

شاہ صاحب کا تصوّف ، ذرّوں میں بھی موتی دیکھ لیتا ہے ، اور میری نظر پہنچے موتیوں پہ بھی نگاہ جاتی ہے تو وہ آنسوؤں میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

ہم نے پھولوں کو چُھوا ، پل بھر میں، کانٹے بن گئے
اُس نے، کانٹوں پر قدم رکھا، گُلستاں کر دیا

وہ "آہ" کے شیدائی ہیں، میں، "نگاہ" کا ۔۔ اُن کا نعرہ ہے :۔

دُعائے صُبح و آہِ شب، کلیدِ گنجِ مقصُود ست
بایں راہ و روش می رو کہ با دلدار پیوندی

اور میں پکار پکار کر کہتا ہوں:-

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ، ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

اُن کے اِشراقی گنبد میں: "السّلام ، اے عشق خوش سودائے ما" کے ترانے چھڑے ہوئے ہیں۔ اور میری کارگاہِ تامّل سے "السّلام ، اے عقل خوش ملجائے ما" کی آوازیں آرہی ہیں۔ وہ ، دِل میں تجلّیات کا مُشاہدہ کرکے فرماتے ہیں ، "ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شُد" اور میں حُجرہ خانۂ ادراک میں گنگنا رہا ہوں کہ:-

"ما ، در پیالہ ، عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم"

وہ تصوّف کی سُہانی چاندنی میں مقاماتِ معنوی کا درس دے رہے ہیں ، اور میں تجسُّس کی کڑی دھوپ میں کھڑا آواز دے رہا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بُرون افتد راز
ورنہ ، در مجلسِ رندان ، خبرے نیست کہ نیست

ان دست و گریبان و مُتضاد حالات میں ، ہمارے درمیان ، آویزش کے بجائے ، ارتباط و اختلاط کا پیدا ہونا ، اور اس کا ، تھوڑے ہی دن کے بعد ، شدید محبّت میں تبدیل ہو جانا ایک عجیب معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا ، قدِ یار کا عالم
میں ، معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اربابِ نظر ہماری محبت کو دیکھتے ہیں تو بھوچکا سے ہو کر رہ جاتے ہیں ، اور ، گھبرا گھبرا کر ، ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ، صاحبو ، خُدا را بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے ، کوئی اللہ کا بندہ کچھ تو روشنی ڈالے اس خرقِ عادت پر کہ خانقاہ و خرابات کے ڈانڈے کیسے مل گئے۔ قُلقُلِ مینا اور نعرۂ "یاہُو" میں کن بُنیادوں پر سمجھوتا ہو گیا ، اور کاشئ بادہ و کعبۂ سجّادہ نے ، ایک دوسرے کی گردن میں باہیں کیوں کر ڈال دیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

اب تو یہ عالم ہے کہ ہم دونوں۔ یعنی شاہ صاحب اور شاعر صاحب ایک دوسرے کی محبت میں بھی پڑ گئے ہیں ، ایک طرف تو میرے برادرانِ فکر ، تیوری چڑھا چڑھا کر ، مجھ کو طعن و تشنیع کا ہدف بنائے ہوئے ہیں ؛ اور ان کی ناکیں لانبی ہو ہو کر مجھ سے ، کہہ رہی ہیں کدھر چلے پیر و مرشد ، کیا اپنی عقل کے ساتھ ساتھ ، ہم سب کا بیڑا بھی غرق کر دینے پر کمر باندھلی ہے ، اور سب کی آنکھیں ، ایک دوسرے کی طرف اُٹھ اُٹھ کر ، یوں پوچھ رہی ہیں۔

چیست ، یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

اور دوسری طرف ؛ حضرت کے صاحب ذکر مُعتقدین میں کھلبلی سی مچی ہوئی ہے ، وہ مٹھیوں میں اپنی اپنی داڑھیاں پکڑ پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ اُن کے آقا و مولیٰ کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ وہ جوش کے سے بدعقیدہ و بے یقین مُلحد کو اپنی مسند پر بٹھاتے ، اور کلیجے سے لگاتے ہیں۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم دونوں ، ایک دوسرے سے گا گا کر یہ کہہ رہے ہیں:-

"میں تو ہو گئی بدنام ، سنوریا تورے لئے"!

بات یہ ہے کہ میرے احباب اور حضرت کے مُعتقدین کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے کیوں ہیں۔ ہم پر تو وہی مَثَل صادق آتی ہے کہ:-

ہر کسے ، از ظنِّ خود ، شُد یارِ من
وز دروں تم ، کس نجُست اسرارِ من

اُن بے چاروں کا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور میرے مابین جو محبّت پائی جاتی ہے وہ اس امر پر مبنی ہے کہ شاہ صاحب کے عشق نے ، میری عقل کے سامنے ، یا ، میری عقل نے اُن کے عشق کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ:-

تم ظلم چھوڑ دیتے ، ہم ترک آہ کرتے
کچھ تم نباہ کرتے ، کچھ ہم ، نباہ کرتے

پر کاربند ہوکر حضرت کے تیقّن اور اس خاک سار کے تفحّص کے درمیان، چپکے سے مصالحت کی کوئی مروّت آمیز صورت نکل آئی ہے۔

اُن لوگوں سے کوئی، بہ بانگ دُہل یہ بات کہہ دے کہ نا بابا اس نوع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے، ہم نے، آپس میں، ذرّہ برابر بھی لین دین نہیں کیا ہے، ہم دونوں اپنے اپنے اصول وعقائد پر پہاڑوں کی طرح، ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور اس تاریخ تک کوئی ایسا قرینہ، دُور دُور تک بھی نظر نہیں آرہا ہے کہ میں، خدانہ خواستہ، الیقان کی طرف مُڑ جاؤں گا، اور حضرت جادۂ تشکّک پر گام زن ہوجائیں گے (اللہ کرے گام زن ہوجائیں) حضرت کا عشق مجھے پھسلا رہا ہے:-

"ور ی گلی آجا، ہو بلما"

اور میری عقل، ٹھُنک ٹھُنک کر کہہ رہی ہے:-

"نجریوں سے بھر دُوں گی جی، چھولنے نہ دُوں گی شریر"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر شدید تخالُف، تبایُن اور تضاد کے باوُجود وہ کون سی طاقت وَر قدرِ مُشترک ہے، جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی محبّت پر مجبور و مامور کر دیا ہے۔ مجھ کو بابا ذہین شاہ کے دل کا حال مَعلوم نہیں، اس لئے قطعیّت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ کو اس قدر کیوں چاہتے ہیں۔ اور وہ میری کون سی ادائے کُفر ہے، جو اُنھیں بھا گئی ہے۔ اس موقع پر ایک پرانی بات یاد آگئی، وہ سُن لیجیے، شاید اُس سے اس صورتِ حال پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ ایک تھیں، خیرآبادکی، فیروزی بجیا، اُن میں کسی قدر، تُنک تھی، ایک دن وہ ملیح آباد آئیں اور اُمُّ الشُّعرا یعنی میری رفیقۂ حیات سے، بڑے استعجاب کے ساتھ کہنے لگیں بیٹا یہ بھُونترا خان اَذان کے بیچ میں میرا نام کیوں لیا کرتے ہیں۔ میری بیوی نے، مُسکراکر، اُن سے کہا فیروزی بجیا کیسی باتیں کر رہی ہو، اللہ اللہ کرو، ہم نے تو بھُونترا خان کی اذان میں تمہارا نام کبھی سُنا ہی نہیں، بولیں، اے تم لڑکیوں کے کان تو ٹھپ ہو چکے ہیں۔ ابھی ابھی تو اُنھوں نے اذان دی تھی، اللہ اکبر، اللہ اکبر، حیّ علی الفلاح

حیّ علی الفلاح، فیروزی بجیا توبہ، (بقلم "تا") میری بیوی نے کہا یہ بھُونترا خان کو کیا لت لگ گئی ہے کہ عین اَذان کے بیچوں بیچ "فیروزی بجیا توبہ" کہتے ہیں، یہ سُن کر اُنھوں نے کہا کہ وہ میرا نام اذان کے بیچ میں اس لئے لیتے ہیں کہ میری کوئی "خولو" وادِ مجہول کے ساتھ، ان کو پسند آگئی ہوگی۔ سو اگر اس خاک سار سے کوئی دریافت کرے کہ شاہ صاحب تجھ کو چاہتے کیوں ہیں تو میں بھی فیروزی بجیا کی طرح جواب دوں گا کہ حضرت کو میری کوئی "خولو" پسند آگئی ہوگی۔

اس "خولو" کی بات کو چھوڑ کر، میں اپنی ذات میں کوئی ایسا وصف نہیں پاتا کہ کوئی پیرِ خانقاہ، مجھ رندِ نامہ سیاہ سے محبت کر سکے۔

سودا نے شاید اسی منزل میں یہ شعر کہا تھا:-

سودا، جو ترا حال ہے، اُتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے، تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

اب رہا یہ امر کہ پرستارِ عقل و بندۂ فکر ہونے کے باوجود، میں بابا ذہین شاہ سے کیوں محبت کرتا ہوں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جس چیز نے، میرے دل کو ان کی طرف کھینچنا شروع کیا وہ ان کا چہرہ ہے۔ چہرہ، انسان کی کتابِ سیرت کی فہرستِ ابواب و مضامین اور اس کی تمام شخصیّت کا ترجمان و مُفسّر ہوتا ہے۔

میں ان اندھوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، جن کو "آنکھوں کے اندھے، نام نین سکھ" کہا جاتا ہے، "ان کے نزدیک تو چہرہ اور تلوار، دونوں یکساں ہوتے ہیں، لیکن "بصرۃ المومنین" رکھنے والے اربابِ نظر، جب کسی کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو ان کے لمسِ نگاہ کی چبھن سے منظور کا چہرہ بولنے لگتا ہے۔

چہرے جھوٹ نہیں بولا کرتے، چند لئے گئے جرائم پیشہ افراد کے سدھے ہوئے دروغ گو چہروں کے علاوہ، تمام انسانوں کے چہرے، بچّا نوے فی صد، سچ اور سچ بولتے ہیں۔ اور، ایک آن میں، انسان کے تمام رذائل و فضائل کے دفتر کھول کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ تو بندہ پرور، جب پہلی بار میں نے ذہین شاہ کا چہرہ

BZSTRFT

دیکھا تو اس نے میرا دل موہ لیا، ان کے چہرے نے مجھ سے کہا کہ میری یہ نورانیت، میری جوانی کا وُہ جمال ہے، جو، ماہ وسال کی چھلنیوں سے گزر کے مجھ پر دمک رہا ہے۔ اور یہ صرف جوانی کے جمال ہی کی سہانی دمک نہیں، اس میں اس کے حسنِ معنوی کی جگمگاہٹ کا عنصر بھی شامل ہے، جس کا میں چہرہ ہوں۔ چہرے کے بعد زبان کی باری آتی ہے، زبان سے پتا چل جاتا ہے کہ متکلم کس خاندان اور کس طبقے کا فرد ہے، اور علم و فضل کے اعتبار سے کتنے پانی میں ہے۔ بعض اوقات چہرہ و زبان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کسی کا چہرہ شریف ہوتا ہے، زبان رذیل ہوتی ہے، اور کسی کی زبان شریف ہوتی ہے، اور چہرہ رذیل ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ چکا ہوں کہ سب سے پہلے شاہ صاحب کے چہرے نے میرے دل پر اثر کیا، ایسے معنوی و صوری اعتبار سے، منوّر و مرتب چہرے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب ان سے حرف و حکایت کی نوبت آئی، تو الفاظ کے رچاؤ، فقروں کے بہاؤ، اور لہجے کے سُبھاؤ نے یہ بات میرے دل پر نقش کر دی کہ میں ایک ایسے غیر معمولی مقناطیسی انسان کے روبرو بیٹھا ہوا ہوں، جس کا چہرہ بھی عالی خاندان ہے، اور زبان بھی نجیب الطرفین۔ حافظ شیرازی کا محبوب بظاہر نرم اور بباطن سخت تھا، اور اسی لئے اس نے، منھ پیٹ کر کہا تھا:-

چہ قیامت جاناں کہ بعاشقان نمودی

رُخِ، ہمچو ماہِ تاباں، دلے، ہمچو سنگِ خارا

لیکن میرے محبوب کے رُخ اور دل میں بڑی ہم آہنگی ہے اور اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں:-

رخے، ہمچو ماہِ تاباں دلے، ہمچو موجِ کوثر

اور اب، جب کہ ہماری ملاقات پُرانی ہو کر، بے تکلفی کے حدود میں داخل ہو چکی ہے، یہ سوچ کر میں بہت ہی خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے اوّلین تاثرات قطعی درست نکلے، اور میں نے اپنی محبت کے واسطے ایک ایسے فرد کا انتخاب کیا ہے جو صوری و معنوی، دونوں جہات سے چاہے اور سراہے جانے کے قابل ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا ایک ایسا غیر معمولی وصف بھی بیان کرنا

چاہتا ہوں جو نقطۂ بیمبروں۔ فلسفیوں اور حقیقی شعراء میں پایا جاتا ہے۔ (شعراء کے ساتھ "حقیقی" کی شرط میں نے اس غرض سے لگائی ہے کہ ہندوستان آکر، یہ عظیم لفظ اس قدر ارزاں ہو چکا ہے کہ یہاں ہر صاحبِ تخلص موزوں طبع تک بند کو شاعر کا خطاب دے دیا جاتا ہے)۔

لیکن شاہ صاحب کے اس غیر معمولی وصف بیان کرنے سے پیشتر آپ کو کسی انگریزی فلسفی کا یہ قول سُنا دینا چاہتا ہوں کہ صدیوں کی فکری تربیت اور ذہنی تطہیر کے بعد، ہماری قوم کو شرافتِ نفس و نجابتِ برداشت کی یہ دولت حاصل ہوئی ہے کہ جب ہمارے مخالفین، ہمارے مُنھ پر، ہمارے مُسلّمات کا مذاق اُڑاتے، اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ہم کو صلواتیں سُناتے ہیں، تو ہم کو غصہ نہیں آتا، غصہ کیسا، اُن کے طعن و تشنیع اور حرفِ دُشنام کو سُن کر ہم مسکراتے ہیں، — پیشانیوں پر بل نہیں پڑنے دیتے، اور معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس وقت ہم بڑے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنے لگتے ہیں کہ شاتم نے جن عُیُوب کو ہم سے وابستہ کیا ہے، آیا ہم میں وہ عُیُوب ہیں کہ نہیں، اور جب ان عائد کردہ عُیُوب میں سے کوئی عیب ہم اپنے میں موجود پاتے ہیں۔ تو اس سے دست بردار ہونے کی دُھن میں لگ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ہے شاہ صاحب کا۔ میں، ان کے منھ پر اُن کے مسلمات و عقائد پر چوٹیں کرتا اور ایسی نظمیں سُناتا ہوں جن کو عرفِ عام میں کافرانہ کہا جاتا ہے، لیکن ان کے ماتھے پر بَل نہیں پڑتے، بل پڑنا تو درکنار، وہ بڑی مٹھاس کے ساتھ مسکرانے لگتے ہیں، اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے، جب مجھے اُن پر بڑا پیار آنے لگتا ہے۔ شاہ صاحب سے میری محبت کی ایک نفسیاتی وجہ اور بھی ہے جانتا ہوں کہ اس وجہ کے بیان کرنے سے میرا ایک پول کھل جائے گا؛ مگر سچ بولنے میں، ایک نہیں، ہزار پول بھی کُھل جائیں تو مردانِ خدا کو پروا نہیں ہوتی۔ جناب والا، یوں تو مجھ کو اس بات پر بڑا فخر ہے کہ میں تفکّر کا دیرینہ پرستار، اور توہم کا کُھلا ہوا دُشمن ہوں۔ لیکن میرے سینے میں شاعر کا کم بخت دل ہے، جو، ذرہ ذرہ سے دھڑکتا

رہتا ہے۔

میری شخصیت شبیر حسن خان اور جوش ملیح آبادی کے درمیان بٹی ہوئی ہے، شبیر حسن خان حکمت کے پجاری ہیں، لیکن جوش ملیح آبادی افسانہ دافسوں کا دلدادہ ہے۔ شبیر حسن خاں بوڑھے ہیں، جوش ملیح آبادی ابھی تک لونڈا ہے۔ شبیر حسن خاں جب تک جاگتے رہتے ہیں، جوش ملیح آبادی، ڈر کے مارے ان کے سامنے نہیں آتا، لیکن، بشری کمزوری کے باعث جب شبیر حسن خان پر، اونگھ طاری ہوجاتی ہے، تو جوش ملیح آبادی، دبے پاؤں آ آ، اور میرے دامن کو، "شاہدِ غیب" کے "جمال" کی طرف کھینچنے لگتا ہے، اُس لونڈے کے ساتھ، بڑی بڑی نورانی داڑھیوں کے، فرشتے بھی آتے ہیں، اور جادو کے جزیرے دکھانے لگتے ہیں، اور اس وقت خدا جانے وہ کون ہے، جو بڑی سُریلی آواز میں یہ گیت گانے لگتا ہے:۔

"گوری ہنس ہنس چلو، مورے سنگ"

اور شاید یہ میرا جوش ملیح آبادی ہے، جس نے مجھ کو شاہ صاحب پر فریفتہ کر رکھا ہے، اور یہاں تک کہ جب دس بارہ دن شاہ صاحب کی مفارقت پر گزر جاتے ہیں تو میرے دل میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اللہ خیر کرے۔ دُھائی شبیر حسن خاں کی!

ایک اور بات جو شاہ صاحب کی جانب میرے دل کو پکارتی ہے، وہ ان کی عالمانہ و شاعرانہ شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کو مشرقی علوم پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور ان کی شاعری میں گاہ گاہ ایسے مقامات آجاتے ہیں کہ دل پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شاہ صاحب تصوّف کے شاعر ہیں، مَیں تصوّف سے کوسوں دور ہوں، لیکن اُن کے بعض اشعار میں اس بلا کی جاذبیت پاتا ہوں کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے اسی کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے"۔

تصوّف کے دوش بدوش حضرت کے وہاں حُسنِ مجازی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے سینے میں ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے جس

کو انسانی جمال کی صیقل نے بنا دیا ہے، اور دراصل یہ حُسنِ مجازی ہی ہے جو سیرت کو جمال، شاعری کو خد و خال اور نفس کو کمال عطا کرتا ہے۔

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے، وہ دل نہیں ہوتا

حضرت کا کلام شائع ہو رہا ہے، اس موقع پر بے ساختہ یہ بات دل میں آئی، میرے نہیں، میرے کھلنڈرے جوش ملیح آبادی کے دل میں آئی کہ میں اس کلام کے حُسنِ قبول کے واسطے اُس بارگاہِ احدیّت میں دُعا کروں، جس نے شعراء کو "تلامیذ الرحمٰن" کا خطاب دیا ہے، لیکن اس بات کے دل میں آتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ حکمت کے پجاری اور تحقیق کے دلدادہ شبیر حسن کا چہرہ سُرخ ہو گیا، ماتھے پر، سیکڑوں شکنیں پڑ گئیں کہا خبردار دُعا نہ مانگنا، یاد ہے تجھ کو اپنے معنوی برادرِ بزرگ اسد اللہ خاں کا یہ شعر:۔

حریفِ مطلبِ مُشکل نہیں، فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

یہ سُنتے ہی میں ہوش میں آگیا — اس لئے دعا سے توبہ کرکے، اَب میں یہ کہوں گا کہ میری یہ دلی تمنا ہے کہ حضرت کا دیوان قبولِ خاطر کا تاج پہنے، اور لوگ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ میری یہ آرزو بھی ہے کہ شاعر صاحب اور شاہ صاحب کی محبت نے یہ درویشی و رندی کا جو سنگم بنایا ہے، اس کا پاٹ روز بروز بڑھے، اور بڑھتے بڑھتے بے کراں ہو جائے۔

مرا، از الست، ہر دم تازہ عشقے
ترا، ہر ساعتے، حُسنِ دگر باد

جوش

کراچی - ۳۰/۴/۶۶

غزلیات

۱۹۱۵ سے ۱۹۶۶ تک

BZSTRFT

BZSTRFT

BZSTRFT

BZSTRFT

BZSTRFT

BZSTRFT

۱۹۶۶ء

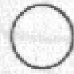
سے

۱۹۴۷ء

تک

نہیں ہے عرش تو کچھ عرش سے کم بھی نہیں ہے دل

یہاں نازل ہوئی ہیں تیری آیاتِ جمال آخر



دل کی ہر دھڑکن پیامِ دوست ہو جاتی ہے کیا
گفتگو اپنی کلامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

پوچھتا ہوں لغزشِ مستانۂ اربابِ عشق،
آئینہ دارِ خرامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

مٹ گئی ہستی اگر نام و نشانِ دوست پر
خود نشانِ دوست نامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

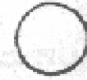
صورتِ ہستی فنا ہو کر بقائے دوست میں
معنیٔ نقشِ دوامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

افضل المخلوق مسجودِ ملائک کے لئے
آدمیت احترامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

ہر نفس راہِ رضائے دوست میں ہو کر فنا
زندگی قائم مقامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

عشق میں تن اور من سب ایک آتے ہیں نظر
دل کی دنیا سقف و بامِ دوست ہو جاتی ہے کیا

رُوح امرِ رب ہے امرِ رب ہے کُن، کُن ہے کلام
رُوحِ انسانی کلامِ دوست ہو جاتی ہے کیا



کیا نہ دیکھا یہ کہو، یہ نہ کہو کیا دیکھا
ہم نے جو کچھ بھی کسی بزم میں دیکھا دیکھا

دیکھنے کو سرِ محفل رُخِ زیبا دیکھا
ہم کو جو کچھ تری آنکھوں نے دکھایا دیکھا

وہ بہاریں کہ ترے ساتھ مجھے دیکھ گئیں
کیا کہیں گی اگر آ کر مجھے تنہا دیکھا

حسنِ خود بیں کو ہے کیا عشق خدا بیں سے گریز
میری آنکھوں سے بھی اپنا رُخِ زیبا دیکھا

سب سے مل کر بھی کم آمیز ہے تمکینِ جمال
تجھ کو دیکھا تو بھری بزم میں تنہا دیکھا

نکتہ چیں دیدۂ ظاہر ہے مری آنکھوں پر
ہم نے آئینہ نہ دیکھا رُخِ زیبا دیکھا

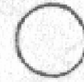
چاندنی چاند سی صورت کی گھنی زُلف کی چھاؤں
پھر اندھیرا نظر آیا نہ اُجالا دیکھا

اس کو اپنا کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا ذہین
جس کو بیگانگیٔ ہوش میں اپنا دیکھا



کوئی میری فغاں سمجھ نہ سکا — میرا طرزِ بیاں سمجھ نہ سکا
لفظ معنوں کا ساتھ دے نہ سکے — غمِ دل رازداں سمجھ نہ سکا
کتنا پیچیدہ تھا بیانِ عشق — کوئی یہ داستاں سمجھ نہ سکا
سیدھی سادی سی عشق کی باتیں — نکتہ رس نکتہ داں سمجھ نہ سکا
جانے کیا لا الٰہ الا اللہ — اس نہیں کو جو ہاں سمجھ نہ سکا
کون یوسف ہے کارواں کے ساتھ — خاک بھی کارواں سمجھ نہ سکا
اس قدر مہربانیوں پر بھی — میں تجھے مہرباں سمجھ نہ سکا
کوئی قدسی نژاد ہو کے ذہین — رتبۂ خاکیاں سمجھ نہ سکا
ایک تیری نظر سے قطعِ نظر — کوئی دل کی زباں سمجھ نہ سکا
دل کی باتیں زباں پہ جب آئیں — کوئی اہلِ زباں سمجھ نہ سکا

کیسے پردے سمجھ پہ ڈالے ہیں
تجھے کوئی عیاں سمجھ نہ سکا



تن دیا، من دیا، دھن دیا، فن دیا
تونے جو کچھ دیا دوست! دشمن دیا

پھول کو میری آنکھیں ترستی رہیں
پھول کو بے طلب تو نے گلشن دیا

میں نے مانگا تھا بن، مجھکو بستی ملی
میں نے بستی جو مانگی مجھے بن دیا

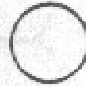
کیوں طلب کی رہی یافت سے دشمنی
دوست کی آرزو تھی تو دشمن دیا

تھا اندھیروں میں روپوش ہونا اگر
کیوں مجھے آپ نے قلبِ روشن دیا

چار تنکے بنامِ نشیمن دیئے
یا مجھے خوفِ برقِ نشیمن دیا

حسن رہبر ہوا جب سے اپنا ذھین
عشق نے پیار سے نام رہزن دیا

کراچی۔ ۱۰ جون ۱۹۶۵ء



کہوں دوست سے دوست کی بات کیا کیا
رہی دشمنوں سے ملاقات کیا کیا

وہ عشوے وہ غمزے وہ نغمے وہ جلوے
طلب کر رہے ہیں ہم آفات کیا کیا

جہاں مجھ کو آیا خیال۔ آ گئے وہ
دکھائی ہیں دل نے کرامات کیا کیا

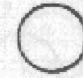
نہ تھی گفتگو درمیاں پھر بھی ان سے
پسِ پردۂ دل ہوئی بات کیا کیا

تری زلف و رخسار کے دھوپ سائے
مجھے یاد آتے ہیں دن رات کیا کیا

یہ ہچکی یہ آنسو یہ آہیں یہ نالے
ملی ہیں محبت میں سوغات کیا کیا

الٹ کر نقابِ صفاتی جو دیکھا
ذھین آپ تھے جلوۂ ذات کیا کیا

BZSTRFT



وہ آئینہ کبھی منہ دیکھتے تھے جس میں تم اپنا
لئے بیٹھا ہے آغوشِ تہی میں عکسِ گم اپنا

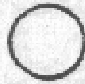
بدل جاتی ہے جب نسبت بدل جاتی ہے ہستی بھی
وہ خود اپنا نہیں رہتا جسے کہتے ہو تم اپنا

چڑھا کر جام، ہو کر مست، سب میخوار غافل تھے
وہ میں تھا جس کے ساغر میں اُنڈیلا تم نے خم اپنا

نہیں سیراب آبِ تیغ کو پیاس آبِ حیواں کی
لئے بیٹھے رہیں ابرو میں وہ ایمائے قم اپنا

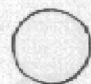
ذہینؔ اجزائے حسنِ دوست جب سے جمع ہیں دل میں
اثاثہ ہو گئے افرادِ عالم کُلُّھُم اپنا

کراچی ۸ راگست ۱۹۵۹ء شنبہ



سلام آیا نہ کچھ پیغام آیا — تغافل اُن کا میرے کام آیا
وہ ہیں اپنے نہ ہونے سے نمایاں — نگاہوں پر نیا الزام آیا
مثل مشہور ہے یہ، میکدے میں — ہوا پختہ یہاں جو خام آیا
حکیمِ عصر کو، مستی میں آکر — علاجِ گردشِ ایام آیا
شبِ غم دل کو تڑپانے ہی آئے — تم آئے یا تمہارا نام آیا
محبت، وقت پر حاکم ہے پھر بھی — تصور اُن کا صبح و شام آیا
درِ پیرِ مغاں پر ہے یہ کتبہ، — گیا خوش کام جو ناکام آیا
جو دیکھا مہد سے لیکر لحد تک — گئیں بے چینیاں آرام آیا

ذہینؔ پیراہنِ یوسفؑ سمجھ کر
غلافِ کعبہ کو میں تھام آیا



کئے ہم نے جنوں سے نکتہ چین و نکتہ داں پیدا
ہم ایسے آدمی ہوتے ہیں دنیا میں کہاں پیدا

ہزاروں بدگمانی حُسن سے اہلِ ہوس کو ہیں
محبت نے کیا ہے حُسن سے حُسنِ گماں پیدا

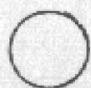
نہ ہوتے ہم تو وہ معبودِ جان و دل کہاں ہوتے
جبیں پہلے ہوئی پیدا کہ سنگِ آستاں پیدا

تبسم بن گئی ان کے لبوں پر ہر فغاں میری
ہوئی ان کے تبسم سے مرے لب پر فغاں پیدا

وہاں جا کر حقیقت رُوح کی ہم پر ہوئی ظاہر
ہوئی ہے تیری صورت سے جہاں تصویرِ جاں پیدا

سمجھ ہو تو وہاں پھر کیوں بنائے آشیاں کوئی
جہاں بجلی کی قسمت سے ہو شاخِ آشیاں پیدا

ذھین اس قافلہ کی گرد چشمِ دل کا سرمہ ہے
ہوئی ہے دل کے صحرا میں جو گردِ کارواں پیدا



کہیں عنوان بدلا ہے کہیں طرزِ بیاں بدلا
ازل سے تا ابد افسانۂ ہستی کہاں بدلا

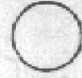
مکیں بدلے، مکاں بدلا، زمیں بدلی، زماں بدلا
نہ بدلے حسن و الفت ہاں زمین و آسماں بدلا

بدلنے کو ہزاروں کروٹیں بدلیں زمانے نے
مگر میری جبیں بدلی، نہ تیرا آستاں بدلا

لباسِ نو بنو ہر دور میں بدلے ہیں دونوں نے
نہ عشقِ سرمدی بدلا، نہ حسنِ جاوداں بدلا

وہی پہلا تبسّم آج تک ہے حُسن کے لب پر
وہی پہلی فغانِ عشق ہے جس سے جہاں بدلا

تغیر سے بری حسن و محبت کی گل افشانی
گراں گذری زمانے پر زمانہ سرگراں بدلا



اُن کی یاد آئے تو کچھ اس کا تقاضا ہو گا
سوچتا ہوں وہ رہے یاد تو پھر کیا ہو گا

چین تھا اس کی حضوری میں نہ دُوری میں سکوں
عمر بھر اس کی محبت میں تڑپنا ہو گا

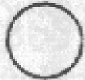
جس نے دیکھا تجھے اے دوست کھلی آنکھوں سے
وہ سمجھتا ہے کبھی خواب میں دیکھا ہو گا

کھل گیا راز اگر حُسن کی یکتائی کا
ہم بُرا جس کو سمجھتے ہیں وہ اچھا ہو گا

خلوت آرا ہے بھری بزم میں وہ پیکرِ ناز
اپنی خلوت میں نہ کیوں انجمن آرا ہو گا

عالمِ ہوش ہو یا جلوہ گہِ جاں ہو ذہین
میں خود آیا نہیں کوئی مجھے لایا ہو گا

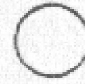
کراچی ۲۳ جنوری ۶۵ء



آغاز اچھا انجام اچھا — نسبت جو اچھی ہر کام اچھا
سب نام ان کے ہر نام اچھا — اچھوں سے اپنا ہر کام اچھا
اچھے ہیں یوں تو سب نام اُن کے — وہ جس سے خوش ہوں وہ نام اچھا
نام و نشانِ جاناں دل و جاں — میں بے نشان و بے نام اچھا
سمجھی ہے منزل میں نے گذرگاہ — اے پختہ کارو! میں خام اچھا

کیا ہے ذہینِ تاجی کی ہستی
تہمت ہے اچھی الزام اچھا

کراچی ۱۷ فروری ۱۹۶۵ء



وہ تیری نگاہوں کا عالم جو مست کن دمستانہ تھا
میخانے کا میخانہ تھا پیمانے کا پیمانہ تھا

آبادئ دل کا عالم بھی اک خواب تھا یا افسانہ تھا
جب آنکھ لگی کاشانہ تھا جب آنکھ کھلی ویرانہ تھا

موقوف تھی دل کی حالت پر ویرانی بھی آبادی بھی
ویرانہ بھی کاشانہ تھا کاشانہ بھی ویرانہ تھا

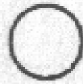
آدابِ تماشا سے واقف کب شیخ و برہمن تھے ورنہ
بُت خانے میں بھی کعبہ تھا کعبے میں بھی بُت خانہ تھا

جب عشق میں گم اطراف ہوئیں جب سوز میں محو جہات ہوئیں
جو شمع تھی وہ پروانہ تھا وہ شمع تھی جو پروانہ تھا

کچھ تیری زلفِ مشکیں کے اسرار کھلے تو مستی میں
دیوانہ تھا وہ ہوش میں تھا جو ہوش میں تھا دیوانہ تھا

کیا جانے کس نے کیا سمجھا اندازِ بیانِ ذہینؔ تھا کیا
ہر لفظ میں ایک حقیقت تھی ہر لفظ مگر افسانہ تھا

کراچی - اپریل، ۱۹۵۷ء



دامِ خود آگہی میں زمانہ چھپا ہوا
پھیلا ہوا درخت ہے دانہ چھپا ہوا

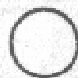
بازار بن گیا ہے خزانہ چھپا ہوا
بیگانہ روبرو ہے یگانہ چھپا ہوا

پہلو میں دل ہے دل میں تڑپ ہے تڑپ میں ہوں
کس سوز و ساز میں ہے ترانہ چھپا ہوا

یادش بخیر، دل نظر آتی ہے وہ نظر
نوکِ خدنگ میں ہے نشانہ چھپا ہوا

کب سے ذہینؔ غم میں ہے کعبہ سیاہ پوش
کب سے ہے گھر میں صاحبِ خانہ چھپا ہوا

۱۲ مارچ ۱۹۵۹ء



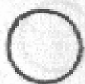
تم روئے زرد و دیدۂ پُرنم نہ دیکھنا
خود اپنی آرزوؤں کا ماتم نہ دیکھنا

کیا چیز ہے کسی کی شبِ غم نہ دیکھنا
تم دیکھ بھی سکو تو یہ عالم نہ دیکھنا

دیکھے ہیں دل نے گیسوئے برہم ہزار بار
تم ایک بار بھی دلِ برہم نہ دیکھنا

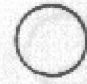
جنت میں تھی خلافتِ ارضی کہاں ذہین
عصمت سے دُور لغزشِ آدم نہ دیکھنا

۷ رجنوری ۱۹۵۹ء



سجودِ شوق پر قیدِ گراں کیا — اگر دل ہے جبیں کیا آستاں کیا
طلب کر اضطرارِ جاودانی — تمنائے سکونِ جاوداں کیا
بلندی اور پستی عشق میں کیوں — محبت میں زمین و آسماں کیا
ابھی احساسِ بربادی ہے باقی — نہیں ہے کچھ تو پھر آہ و فغاں کیا
حرم میں دیر میں دنیا و دیں میں — تمھیں تم ہو یہاں کیا ہے وہاں کیا
نہیں ہوں میں جہاں وہم و گماں ہیں — جہاں میں ہوں وہاں وہم و گماں کیا

ذہین اشعار سے مقصود اپنا
بیانِ حُسن ہے حُسنِ بیاں کیا



چمن طرازِ بہاروں میں بھی سکوں نہ ملا
مگر گلوں سے وہ رخسارِ لالہ گوں نہ ملا

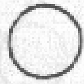
اسی سبب سے جنوں کو خرد سمجھ نہ سکی
جہان میں جسے حکمت ملی، جنوں نہ ملا

چٹک گلوں کی صدائے شکستِ دل سے ملی
مگر گلوں کا دلِ خوں شدہ سے خوں نہ ملا

زباں پہ عہدِ وفا ہے نظر میں عزمِ جفا
مجاز اپنی حقیقت سے آہ کیوں نہ ملا

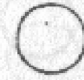
مجاز عینِ حقیقت مری نگاہ میں ہے
تری نگاہ سے تیرا بیان کیوں نہ ملا

مجھے یہ کس نے فریبِ سکوں دیا ہے ذہین
اگر سکوں نہ ملے تو نہ کہہ سکوں نہ ملا



یہ کیا ہوا کہ دل میں غمِ دل نہیں رہا — کچھ انبساطِ زیست کا حاصل نہیں رہا
کچھ انبساطِ زیست کا حاصل نہیں رہا — پہلو میں دل ہے، دل میں غمِ دل نہیں رہا
منزل قدم قدم پہ رہی میرے ساتھ ساتھ — ہرگز نہیں رہا میں جہاں دل نہیں رہا
بہلاؤں کیسے ہمتِ مشکل پسند کو — اب کوئی کام عشق میں مشکل نہیں رہا
قائم ہے اس سے وسعتِ دریا کا اعتبار — جس موج کے نصیب میں ساحل نہیں رہا
ممکن نہیں کہ تجھ سے رہا ہو وہ باخبر، — جو اپنے آپ سے کبھی غافل نہیں رہا
آئینہ دیکھنے میں ہو گم، جیسے آئینہ — اب دل میں وہ ہی وہ ہے کہیں دل نہیں رہا
طوفانِ اضطراب میں گم ہو گئیں جہات — اب امتیازِ بسمل و قاتل نہیں رہا
دل جلوہ گاہِ دوست میں داخل ہوا تو کیا — بیتابیٔ نگاہ کے شامل نہیں رہا

کیوں فرشِ راہِ دوست نہیں گام گام پر
دل عرش ہو گیا ہے تو کیا دل نہیں رہا



عشق میں خود حسنِ غارت گر لٹا

لوٹنے والا یہاں آ کر لٹا

تھا دلِ برباد میں آباد کون ؟

لوٹنے والے ! یہ کس کا گھر لٹا

نقدِ دین و نقدِ ایماں نقدِ دل

پاس جو کچھ ہو لٹا اُن پر لٹا

بوالہوس تھے عقل کے سرمایہ دار

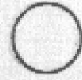
عشق میں نادار ہی اکثر لٹا

تھی محبت ہی وہ راہِ پُر خطر

ساتھ رہ رو کے جہاں رہبر لٹا

لوٹنے والوں کا شکوہ کچھ نہیں

اپنے ہاتھوں ہی ذھینؔ اکثر لٹا



جی چاہے تو شیشہ بن جا جی چاہے پیمانہ بن جا

شیشہ پیمانہ کیا بننا مے بن جا میخانہ بن جا

مے بن کر میخانہ بن کر مستی کا افسانہ بن جا

مستی کا افسانہ بن کر ہستی سے بیگانہ بن جا

ہستی سے بیگانہ ہونا مستی کا افسانہ بننا

اس ہونے سے اس بننے سے اچھا ہے دیوانہ بن جا

دیوانہ بن جانے سے بھی دیوانہ ہونا ہے اچھا

دیوانہ ہونے سے اچھا خاکِ درِ جانانہ بن جا

خاکِ درِ جانانہ کیا ہے اہلِ دل کی آنکھ کا سرمہ

شمع کے دل کی ٹھنڈک بن جا نورِ دلِ پروانہ بن جا

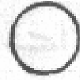
سیکھ ذھینؔ کے دل سے جلنا کاہے کو ہر شمع پہ جلنا

اپنی آگ میں خود جل جائے تو ایسا پروانہ بن جا

کراچی ۱۹۶۵ء

تھی محبت کبھی فقط تم سے — آج ہر چیز بن گئی محبوب
تھے کبھی تم ہی مرکزِ خوبی — آج کوئی بھی شے نہیں ناخوب
آج مطلوب ذرہ ذرہ ہے — تم ہی تم تھے کبھی میرا مطلوب
عشق منسوب تھا کبھی تم سے — آج تم بھی ہو عشق سے منسوب
میں نہیں میں، نہ آج تم ہو تم — ہو گئے ایک طالب و مطلوب
عشق تنہا حقیقتِ عالم — یہ حقیقت مجاز سے محجوب
ہوش ہے "جزو" اور مستی "کل" — حسن سالک ہے عشق ہے مجذوب
ہوشیاری ہے حسن میں خوبی — ہوشیاری ہے عشق میں معیوب
اک تبسم ہے دوسرا ہے "آہ" — ایک یوسفؑ ہے دوسرا یعقوبؑ
بیقراری میں عشق گریۂ نوح — صبر میں عشق حضرتِ ایوبؑ

راہِ اخلاص میں خلیلؑ ہے عشق
عشق میں وہمِ غیر ہے مسلوب

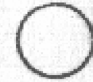


ہزار بار محبت میں کھا چکا ہوں فریب
ہزار بار لٹی ہے متاعِ صبر و شکیب

مجاز میں نظر آنے لگی تجلیِ غیب
مری نظر میں کسی کا ہنر ہے آج نہ عیب

ہزار ہاتھ میں دامن ہو جیب ہو لیکن
رہا ہے دستِ جنوں بے نیازِ دامن و جیب

ہمیشہ خاک نشینانِ میکدہ ہیں ذہین
ہزار مہر بدامن، ہزار ماہ بجیب



خیال ہے نہ تصور مشاہدہ ہے نہ خواب
طرح طرح سے اٹھاتا ہوں اپنے رُخ سے نقاب

اٹھی نگاہ تو ہر سمت سے اُٹھے پردے
نظر حجاب میں ہے تو جمال زیرِ حجاب

نئے مقام، نئی منزلیں، نئی راہیں
قدم قدم پہ جنوں کے لئے نئے آداب

نگاہِ عشق حقیقت ہے حُسنِ عالم کی
متاعِ حُسن بہت، جنسِ عاشقی کم یاب

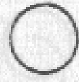
زباں ہے نہ بیاں ہے مگر جنوں کے لئے
تری ادائیں تکلم تری نگاہ خطاب

مریدِ پیرِ مغاں فخرِ میکشاں ہے وہی
جو کر سکے غمِ ہستی کو غرقِ جامِ شراب

وہ خام ہے جو طلب گارِ جام ہے ساقی
تری نظر ہے ہمیں تو مسبب الاسباب

ہم ان کو دیکھنے والے ہیں ہم کو دیکھ ذہین
کبھی یہ ہم نے نہ دیکھا یہ لطف ہے کہ عتاب

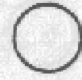
کراچی ۳؍مئی ۱۹۶۱ء پنجشنبہ



دل ہوا تیری نظر سے فیض یاب — میں ترا جلوہ نہ تو میرا حجاب
تم حسینانِ جہاں میں منتخب — اور میرا دل تمہارا انتخاب
ان کو مجھ سے مجھ کو ان سے ہے حجاب — دیکھئے پہلے اُٹھے کس کا نقاب
سرزمینِ دل میں سرگرمِ سفر — تھے ہزاروں چاند لاکھوں آفتاب
موج ظاہر ہے کہ پیچ و تابِ موج — موج کیا ہے در حقیقت پیچ و تاب
وہ جسے دنیا سمجھتی ہے سکوں — در حقیقت ہے کمالِ اضطراب
خاک بن کر کوئے جاناں میں رہے — آدمی کی ورنہ مٹی ہے خراب
تابکے آخر نزاعِ کفر و دیں — تم اُٹھادو رُخِ رنگیں سے نقاب

خاکساری ہم کو زیبا ہے ذہین
ہم کہ ہیں دلدادگانِ بوترابؑ

کراچی ۱۴ جنوری ۱۹۵۹ء



اللہ اللہ وہ جمالِ دل فریب
محفلِ کونین ہے محفل فریب

خود فریبی ہے غمِ موت و حیات
اب وہ دریا ہو کہ ہو ساحل فریب

میں جہاں بھی ہوں وہیں منزل بھی ہے
ورنہ ہر جادہ ہر اک منزل فریب

قیس پر بھی یہ حقیقت کھل گئی
خود ہے لیلیٰ محمل و محمل فریب

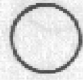
عشق مشکل ہے نہ عشق آسان ہے
عشق میں آسانی و مشکل فریب

اضطرابِ عشق میں گم ہیں جہات
امتیازِ بسمل و قاتل فریب

حق تو یہ ہے بے محبت زندگی
خود فریبِ باطل و باطل فریب

ہر تمنا عشق میں حرفِ غلط!
عاشقی میں معنیٔ حاصل فریب

یہ خدائی بندگی میں اے ذہین
یہ فریبِ کامل و کامل فریب



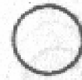
نقشِ دوامِ صفحۂ ہستی ہے نامِ دوست
دنیائے کیف و عالمِ مستی ہے نامِ دوست

اس نام سے شراب میں آئی ہیں مستیاں
پروردگارِ بادہ پرستی ہے نامِ دوست

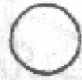
تحریرِ دستِ دوست ہے ہر ایک ہاتھ میں
پانچ انگلیوں میں نامۂ دستی ہے نامِ دوست

یہ نام ہے مدارِ زمیں، دورِ آسماں
حیرت گہِ بلندی و پستی ہے نامِ دوست

عالم ذہین عالمِ اسمائے دوست ہے
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ بستی ہے نامِ دوست



رفتارِ عشق پرتوِ حُسنِ خرامِ دوست
ہر راہ ، راہِ دوست ہے ، ہر بام ، بامِ دوست
ہر گام ، راہِ دوست میں ہوتا ہے گامِ دوست
اپنا مقام بھی نظر آیا مقامِ دوست
کیا زندگی تمام اسیری ہے عشق میں
ہر سانس ایک پھانس ہے ہر دم ہے دامِ دوست
وہ دل میں آ گئے کہ وہاں دل چلا گیا
آئی کہاں سے دل میں تجلیٔ بامِ دوست
تقدیرِ چشم و گوش پہ نازاں ہوں اے ذھین
دیکھا ہے حُسنِ دوست سُنا ہے کلامِ دوست



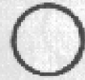
یہ خواب، کہ بیداریٔ تقدیرِ محبت
یہ خواب، کہ افسانۂ تاثیرِ محبت
قرآنِ محبت ہے کہ تفسیرِ محبّت
ہر لفظ میں ہے آیۂ تطہیرِ محبّت
وہ، عشق کی آراستہ پیراستہ تمثال
میں، حُسن کی کھینچی ہوئی تصویرِ محبت
سر تا بقدم جلوۂ اللہُ جمیلٌ
وہ حُسن کے انوار، وہ تنویرِ محبت
قربان، میں اُن کی نگہِ ناز کے قربان
سو جان سے دل ہے ہدفِ تیرِ محبّت
دنیائے محبّت میں خرد کام نہ آئی
ہے کارِ جنوں، صاحبِ تدبیرِ محبت

صد شکر کہ اُٹھ ہی گئے وہ ہوش کے پردے
کام آ ہی گیا نالۂ شبگیرِ محبت

جس وقت ہوا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں
ہر سانس بنا حلقۂ زنجیرِ محبت

وہ قلب کی دھڑکن میں محبت کے فسانے
گویا، لبِ خاموش میں تقریرِ محبت

کل رات کو مہمان تھا ویرانۂ دل میں
معمارِ جنوں، صاحبِ تعمیرِ محبت



اے خدائے عشق اے ربِ محبت الغیاث
عشق آفت ہے، محبت ہے قیامت الغیاث

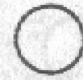
کیا ہوئے وہ دن کہ جب ہنسنے ہنسانے سے تھا کام
اب تو جی بھر کر نہیں رونے کی فرصت الغیاث

وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر شے سے محبت تھی مجھے
آج ہر شے سے طبیعت کو ہے وحشت الغیاث

یہ حقیقت در حقیقت، یہ مجاز اندر مجاز
المدد حُسنِ حقیقت، حُسنِ صورت الغیاث

صورتِ اصنام میں حسنِ حقیقی جلوہ گر
کس قدر دُشوار ہے راہِ حقیقت الغیاث

لُٹ گیا سرمایۂ ایمان و دیں اپنا ذھین
قلبِ مومن پر ہے کافر کی حکومت الغیاث



دیکھیں گے دکھائیں گے جہانِ گزراں آج
لائے ہیں انھیں ساتھ سرِ آبِ رواں آج

جب سے یہ سنا ہے کہ وہ آتے ہیں یہاں آج
خود اپنے یقیں پر مجھے کیا کیا ہے گماں آج

وہ رُخ کہ نہ تھا بارِ نقاب اس پہ گراں کل
اُس رُخ پہ نگاہوں کی لطافت ہے گراں آج

طوفانِ محبت ہے کہ طغیانِ جوانی
دنیا کی ہر اک شے نظر آتی ہے جواں آج

ذرّے بھی یہاں عرش کی آنکھوں کے ہیں تارے
معراجِ محبت میں ہے چشمِ نگراں آج

انجم کے کٹورے ہیں کہ ذرّوں کے سکورے
محدود نہیں ہے کرمِ پیرِ مغاں آج

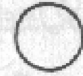
کیا حسن و محبت میں کوئی فرق نہیں ہے
کیوں ان کی نظر پر ہے مجھے دل کا گماں آج

گم عالمِ مستی میں ہے کیفیتِ ہستی
وہ کون ہے، یہ کیا ہے، مجھے ہوش کہاں آج

کل، خوں جگرِ لالہ تھا، تاراجِ خزاں سے
ہے دستِ بہاراں پہ حنا خونِ خزاں آج

تاراجِ غمِ دل پہ ہے نازاں نگہِ ناز
وہ آنکھ میں آنسو ہیں نہ وہ لب پہ فغاں آج

کیا بات ذھین اس ترے اندازِ بیاں کی
سمجھے وہ تری بات حدیثِ دگراں آج



ازروئے شرع روئے حسیں پر نظر مباح
لیکن وہی نظر نہیں بارِ دگر مباح

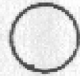
تعظیمِ زلف و رُخ ہوئی شام و سحر مباح
سجدہ حریمِ حُسن میں آٹھوں پہر مباح

پائے صنم پہ سجدہ بتاتے ہیں جو حرام
ان کے لئے پرستشِ دیوار و در مباح

کہتے تھے جو حرام ہے مستی و بیخودی
کہنے لگے ہیں وہ بھی تجھے دیکھ کر مباح

تکمیلِ آرزو ہے مرا فرض اے ذہین
وہ جانتے ہیں خونِ تمنا مگر مباح

اپریل ۱۹۵۹ء سہ شنبہ



حُسنِ صبیحِ دوست ہے رُوحِ روانِ صُبح
لیلائے شب ہے گردِ رہِ کاروانِ صُبح

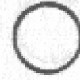
بٹنے لگی ہے نور کے تڑکے مئے طہور
دیتی ہے اذنِ بادہ کشی پھر اذانِ صُبح

ہوتی ہے میکدے میں نمازِ سحر ادا
پھر بن گیا ہے نغمۂ قلقل اذانِ صُبح

پینے لگے شراب میں پھر نور گھول کر
شیخِ حرم ہیں دیر میں پیرِ مغانِ صُبح

کیفِ طہور و نور و سرور و حضور دیکھ
اے دل ترے لئے ہیں یہ سب ارمغانِ صُبح

وہ مہرِ نیم روز ہے لیکن مجھے ذہین
ہوتا ہے روئے دوست پہ اکثر گمانِ صُبح



پڑھ رہا تھا کل تک جو زہد کا مقالہ شیخ
ہو گیا ہے رندوں کا آج ہم پیالہ شیخ

اُس طرف گیا واعظ، شیخ اِس طرف آیا
بن گیا حقیقت میں شاخ کا امالہ شیخ

ایک ساغرِ شفاف، سینہ آئینہ، دل صاف
نفس کے ذمائم کا فرض ہے ازالہ شیخ

چھوڑ کر حرم ایسی جا بہ یادِ با توقیر
لے رہا ہے ساقی سے دیر کا قبالہ شیخ

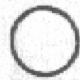
میکدے میں آتے ہی آ گئے تمام آداب
پی رہا ہے ساقی کے جام کا غُسالہ شیخ

دعوتِ گُزک رد ہو یہ گناہِ شرعی ہے
احتیاطِ تقویٰ ہے ایک دو نوالہ شیخ

فتح عذرِ مستی نے پائی عذرِ شرعی پر
کر سکا نہ رندوں سے حیلۂ حوالہ شیخ

لے ذہینؔ سے کوئی جامِ آتش تر لے
آگ اور پانی کا دیکھ استحالہ شیخ

۱ اپریل ۱۹۵۹ء روز شنبہ



خود اپنی بارگہِ علم میں ہوں سر بسجود
کہ اپنے علم سے باہر وجود ہے نہ شہود

وہ تیرا حُسن ہو یا میرا عشق لا محدود
کہیں نہیں متجاوز وجود سے موجود

یہ علم، عالم و معلوم میں حجاب نہیں
مجھی سے مجھ پہ ہے میری تجلّیوں کا ورود

مقامِ اَشھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
حضورِ عشق میں کیا امتیازِ غیب و شہود

ذہینؔ و میکدہ و ساقیٔ ذہینؔ نواز
صلوٰۃ بادہ پرستی پہ میکشی پہ درود

شکایت ہے نہ شکوہ ہے نہ فریاد
نہ آیا کچھ بھی ان کو دیکھ کر یاد

جہاں کل چھاؤنی چھائی تھی دل نے
بہت آتے ہیں وہ دیوار و در یاد

بچھائے تھے جہاں سجدے نظر نے
نہ آئے کیوں وہ خاکِ رہگذر یاد

اسیری فکرِ آزادی کی دشمن
نہیں آتے قفس میں بال و پر یاد

کسی منزل میں دل اپنا نہ بہلا
حضر میں بھی رہا وقتِ سفر یاد

ذھین اُن کی حضوری میں جو گذرے
وہ لمحے بھی رہیں گے عمر بھر یاد

نامۂ شوق و محبت کاغذ
خامۂ حُسن کی نُدرت کاغذ

مظہرِ لطف و عنایت کاغذ
دوست کی دوست کو خلعت کاغذ

نامۂ دوست فرستادۂ دوست
حاملِ فخرِ رسالت کاغذ

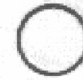
محلِ نصف ملاقات ہے یہ
ہجر میں وصل کی صورت کاغذ

خط سے ظاہر ہے خد و خال کا حال
جامعِ غیب و شہادت کاغذ

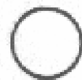
ان کے ہاتھ، ان کی نظر، ان کا قلم
ہے بڑا صاحبِ نسبت کاغذ

دل کے دریا میں یہ کاغذ کشتی
نذرِ طوفانِ محبت کاغذ

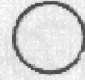
دو جہاں حرفِ محبت ہیں ذھین
حاملِ حرفِ محبت کاغذ



دل فسردہ کو پیاری نظر سے پیار نہ کر
خزاں کے سامنے شرمندۂ بہار نہ کر
کمالِ ہوش یہاں غم کو غم سمجھنا ہے
کسی کو غم کی حقیقت کا رازدار نہ کر
ہزار بار توجہ کا شکریہ — لیکن
جو وضع نبھ نہ سکے دوست اختیار نہ کر
وہ جلوہ گر ہیں ترے سامنے، نگاہ اٹھا
جہاں نظر کی ضرورت ہے انتظار نہ کر
ذہین ترکِ محبت کرے، خدا نہ کرے
یہ جبرئیل کہیں، تو بھی اعتبار نہ کر



ہر چند کسی شے میں نہیں جلوہ کناں اور
ہر شے میں ہوا دیکھنے والوں کو گماں اور
تو اور، نہ میں اور، نہیں اور، نہ ہاں اور
ارباب یقیں اور ہیں، اصحابِ گماں اور
ڈھونڈیں گے کسی اور کو، وہ پائیں گے کس کو
جائیں گے ترے در سے وہ جائیں گے کہاں اور
سب اہلِ چمن، ذکرِ چمن میں ہیں، مگر دوست
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور
آنکھوں کو بچھا، دل کو جھکا، دیدہ و دل مانگ
چشمِ نگراں اور ہے قلبِ نگراں اور
انساں کے بکھرے ہوئے اجزائے اَنا، دیکھ!
تن اور ہے، من اور ہے، دل اور، زباں اور
آتش کدۂ عشق میں خاشاکِ خرد ڈال،
کچھ دیر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں دھواں اور
ہر مست ذہین اور ہی عالم میں ہے سرمست
مے اور، نہ جام اور، نہ وہ پیرِ مغاں اور



دل ہے اسیرِ حلقۂ شام و سحر ہنوز
بدلی گئی نہ گردشِ شمس و قمر ہنوز

مانوس لامکاں سے نہیں ہے بشر ہنوز
آگاہ لازماں سے نہیں ہے نظر ہنوز

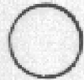
کافر دماغیاں ہیں کمالِ عروج پر
انساں نہیں ہے صاحبِ دل دیدہ ور ہنوز

کب ہے فضا پیامِ محبت کو سازگار
نکلا نہیں ہے دل سے زمانے کے ڈر ہنوز

افلاک پر کمند اسیرِ کمندِ نفس
مقصد سے دُور دُور ہے قصدِ سفر ہنوز

پرواز کے لئے اسے آلات چاہئیں
نکلے نہیں ہیں آدمِ خاکی کے پر ہنوز

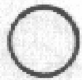
طاری ہے نزعِ دہرِ کہن سال پر فضیں
انساں جوان فکر نہ بالغ نظر ہنوز



کوئی محمود ہے یہاں نہ ایاز — کوئی بندہ یہاں نہ بندہ نواز
بزمِ یکتائیِ جمال ہے یہ — اک حقیقت کے بے شمار مجاز
خود تجلی ہے خود تجلائی — آپ جلوہ ہے آپ جلوہ طراز
آپ ہی شمع آپ پروانہ — آپ ہی سوز آپ ہی وہ ساز
پسِ پردہ ہے آپ بے پردہ — خود فسانہ ہے خود فسانہ طراز
بت پرست آپ بت شکن بھی آپ — آپ سرتا بپا بتِ طناز
آپ عاشق ہے آپ ہی معشوق — آپ شاہد ہے آپ شاہد باز
آپ ناز و تبسم و شوخی — آپ ہی آہ و درد و سوز و گداز
ناز و انداز پر فدا خود ہی — آپ ہی ناز آپ ہی انداز
لب و رخسار و چشم و ابرو آپ — آپ شانہ ہے آپ زلفِ دراز
آپ شوقِ لقا میں بزم آرا — آپ ذوقِ حیا میں خلوت راز
آپ سرمایۂ حقیقت ہے — آپ ہی صدرِ جلوہ گاہِ مجاز

آپ ہی کائنات سے ہم رنگ — آپ ہی کائنات سے ممتاز
آپ ہی میرے عجز میں ظاہر — معجزہ آپ آپ ہی اعجاز
دشمنِ رنگ و بوئے گلشن آپ — آپ ہی رنگ و بوئے گلشنِ ناز
آپ کو آپ جانتا ہے وہ — آپ ہی راز آپ ہی ہمراز
آپ ظاہر ہے آپ ہی باطن — آپ انجام آپ ہی آغاز
آپ بیمار آپ بیماری — آپ بیچارہ آپ چارہ ساز
خود قفس اور خود اسیرِ قفس — خود ہی پرواز خود پرِ پرواز

آپ بندہ ہے آپ ہی مولیٰ
خود غریب اور خود غریب نواز



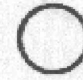
ملتا نہیں ہے دہر میں کوئی ادا شناس
مومن ہے بُت شناس نہ کافر خدا شناس

بھولی ہے کب محبتِ بے مدعا تمہیں
دل ترکِ مدعا میں رہا مدّعا شناس

تیری نگاہِ ناز ہے دانائے رازِ دل
تیری نگاہِ ناز کے ہم ہیں ادا شناس

اپنا مآل آپ کی پہلی نگاہ تھی
ہم ابتدا شناس ہیں ہم انتہا شناس

دنیا رہِ یقیں سے بہت دُور ہے ذہین
دل رہ شناس ہے نہ نظر رہنما شناس



کھوئی ہوئی اُسی ایک ادا کی رہی تلاش — اس بیخودی میں مجھ کو خدا کی رہی تلاش

ہر وقت میرے ساتھ ہے ہر لحظہ میرے پاس — کیوں دُور دُور قُربِ خُدا کی رہی تلاش

جو مل گیا ہے ڈھونڈھ رہا ہوں اُسی کو میں — منزل پہ آکے راہنما کی رہی تلاش

ہم تو وفا شعار ہیں اپنے لئے نہیں — تیرے لئے ہی تیری وفا کی رہی تلاش

جو بارگاہِ حُسن میں دل سے قبول ہو — ایسی کسی حسین خطا کی رہی تلاش

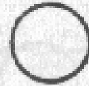
سجدے کی آرزو بھی ہے ساقی بھی روبرو — مستی میں ایک لغزشِ پا کی رہی تلاش

ہیں مہربانیوں کے بتوں سے امیدوار — جن کو خدا کے لطف و عطا کی رہی تلاش

ہوتا کہیں وہ گم تو اُسے ڈھونڈتے ذہین

وہ خود ہی گُم ہیں جن کو خدا کی رہی تلاش

۳/اپریل ۱۹۵۹ء جمعہ



دل پر آواز ہے زباں خاموش — گوشِ دل کے لئے سکوت خروش

لرزشِ بادہ ہے یہ ساغر میں — یا وہ محوِ خرام زلف بدوش

پاس کے پاس اور دُور کے دُور — دل میں موجود آنکھ سے روپوش

کیا اڑے ہوش جب نقاب اٹھے — کیا ہے تیرا حجاب میرا ہوش

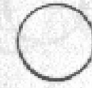
حسن بھی مست عشق بھی سرشار — دیکھئے کس کو آئے پہلے ہوش

چاند نکلا ہے سوگوارانہ، — شبِ غم، چاندنی اداس، خموش

کیا گلستاں میں آگ برسی ہے — غنچہ و گل تمام شعلہ پوش

لاکھ بار آزما چکا ہوں ذہین

دل کی آواز ہے نوائے سروش

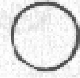


تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں تھیں راتیں خاص
دل میں گھنگور گھٹا آنکھوں میں برساتیں خاص

وہ پسِ پردۂ دل آپ سے کچھ باتیں خاص
لب تک آجائیں تو بن جائیں مناجاتیں خاص

سوزِ دل ، دردِ جگر ، نالۂ شب ، آہِ سحر
مرحبا ، بارگہِ حُسن کی سوغاتیں خاص

معجزے حسن کے جو عام ہیں دنیا میں ذھین
حضرتِ دل نے دکھائی ہیں کراماتیں خاص



ذوقِ محبت ہے عام کیفِ محبت ہے خاص
ایک قیامت ہے عام ایک قیامت ہے خاص

نورِ بصارت ہے عام نورِ بصیرت ہے خاص
ظاہرِ صورت ہے عام باطنِ صورت ہے خاص

دولتِ دارین عام نعمتِ کونین عام
سوز کی دولت ہے خاص درد کی نعمت ہے خاص

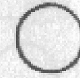
حفظِ مراتب بھی ہے حُسن کے پیشِ نظر
عام سے نسبت ہے عام خاص سے نسبت ہے خاص

حُسنِ کم آمیز کے عشوۂ پرہیز میں
عام نمود گریز جذبِ حقیقت ہے خاص

دیکھنے والوں کا ہے ذوقِ نظر مختلف
یا نظرِ حُسن کا حُسنِ رعایت ہے خاص

جلوہ گری میں ہے گم غایتِ جلوہ گری
ورنہ سرِ بزم بھی آپ کی خلوت ہے خاص

شکر و شکایت خبر، عشق و محبت نظر
شکرِ کرم بھی ذھین وجہِ شکایت ہے خاص



بجا ہے خدا کی عبادت ہے فرض
مگر سب سے پہلے محبت ہے فرض

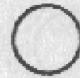
کرامت فقط ترکِ عادت نہیں
ہوئی ترک عادت تو عادت ہے فرض

نہ ہو عالمِ دل جو بزمِ نظر
نہاں خانۂ دل میں خلوت ہے فرض

مصیبت میں دینے تسلّی وہ آئیں
تو پھر اکتسابِ مصیبت ہے فرض

صنم قبلہ ہو تو یقیناً قبول
جو سجدہ بردئے شریعت ہے فرض

بتوں کو اجاگر کریں ہم ذہین
اگر انکشافِ حقیقت ہے فرض



اپنی دُھن میں ہوں خیالِ ماسوا سے کیا غرض
آشنا سے کیا غرض ناآشنا سے کیا غرض

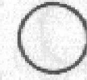
بات کچھ دل کی سُنی، اے نسبتِ ذات و صفات
ہو بتوں سے بے نیازی تو خُدا سے کیا غرض

زندگی کا اوّل و آخر تھی وہ پہلی نظر
ابتدا سے کیا تعلق انتہا سے کیا غرض

مدّعا آموز ہے حُسنِ تمنّا آفریں
اس دلِ بے مُدّعا کو مُدّعا سے کیا غرض

عمر بھر اس کی جفا کو ہم وفا سمجھا کئے
کیا خبر وابستہ تھی اس بے وفا سے کیا غرض

حسنِ مستغنی کی ہم نے بات رکھ لی اے ذہین
ورنہ عشقِ بے غرض کو التجا سے کیا غرض



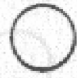
جب ہو سکے نہ زہرہ جمالوں سے احتیاط
ممکن نہیں ہے دیکھنے والوں سے احتیاط

خود جانتا ہے حُسن مُرادِ دل و نظر
پھر بھی دل و نظر کو سوالوں سے احتیاط

کیا ذوقِ غم، فریبِ تبسم میں آ گیا
آہوں سے احتیاط ہے نالوں سے احتیاط

عبرت ہے اہلِ دل کے لئے داستانِ طور
شعلہ مثال برق جمالوں سے احتیاط

خود ٹوٹتے ہیں خارِ ذہین آبلوں کے ساتھ
کرتے ہیں خار پاؤں کے چھالوں سے احتیاط



طبعِ معنیٰ پہ حقیقت میں گراں ہیں الفاظ
عین معنیٰ ہیں کہ معنوں کے نشاں ہیں الفاظ

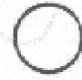
لفظ و معنیٰ میں جو نسبت ہے تن و رُوح کی ہے
ورنہ معنیٰ ہیں کہاں اور کہاں ہیں الفاظ

نہ عبارت، نہ اشارت، نہ حکایت، نہ صدا
بزمِ مفہومِ تمنا میں فغاں ہیں الفاظ

یوں ہے اس عالمِ اجسام میں وہ جانِ جہاں
جیسے معنیٰ میں نہاں اور عیاں ہیں الفاظ

لفظ معنیٰ ہیں یہاں عینِ حقیقت ہے مجاز
ورنہ الفاظ کے معنیٰ بھی یہاں ہیں الفاظ

دو جہاں میں جو عیاں ہے وہ حقیقت ہے ذہین
پھر حقیقت میں یہاں دونوں جہاں ہیں الفاظ



ممنوع بیخودی ہے نہ دورِ شراب منع
یہ میکدہ ہے اس میں ہے شرم و حجاب منع

اوجھل پلک جھپکنے میں ہوتا ہے کارواں
غفلت یہاں حرام ہے، غفلت میں خواب منع

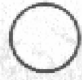
برقِ جمال جب ہے نظر سوز آپ ہی
اے حُسنِ بے نقاب! تجھے ہے نقاب منع

کیا کیا دل و نظر کی خطائیں ہوئیں معاف
حسن اور عشق میں ہے حساب و کتاب منع

دل کا معاملہ تھا، نظر سے وہ طے ہوا
حُسن اور عشق میں ہے سوال و جواب منع

آئینہ دیکھنا تو کہاں منع ہے، مگر
تیری مثال منع ہے، تیرا جواب منع

دیوانگانِ عشق سے محشر میں اے ذہین
ہر باز پرس منع ہے ہر احتساب منع



ملا ساقیِ عرش سے وہ ایاغ
زمیں پر ہیں ہم آسماں پر دماغ

ملا عالمِ رنگ و بو کا سراغ
ہوئے ہیں گلستاں میں روشن چراغ

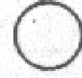
بدلتی ہے فطرت بھی ماحول سے
ہوئے باغ میں سبز کتنے کلاغ؛

یقیناً بہارِ مجسّم ہو تم!
تمہیں دیکھ کر دل ہوا باغ باغ

جو تم آئے تو مسکرانے لگے
یہ دشت و دمن اور یہ باغ و راغ

ترے روئے روشن نے اپنے لئے
جلائے ہیں دیر و حرم میں چراغ

تمہارے بغیر آہ جانِ ذہین
نظر خستہ خستہ ہے دل داغ داغ



دل کھِچا جاتا ہے خود ہی کوئے جاناں کی طرف
دیکھئے دیکھا بھی جائے روئے جاناں کی طرف

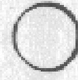
آسماں پر ماہِ نو، کعبے میں محرابِ حرم
یہ اشارے ہیں خمِ ابروئے جاناں کی طرف

حُسن تک پہنچا ہے، غم کا سلسلہ بھی عشق میں
برہمی دل کی چلی گیسوئے جاناں کی طرف

ایک ہی منزل پہ جا کر مل گئے دونوں ذہین
وہ چلے سوئے حرم، ہم کوئے جاناں کی طرف



حُسنِ تاباں اُس طرف ہے عشقِ سوزاں اِس طرف
وہ پریشاں اُس طرف ہیں، ہم پریشاں اِس طرف
کعبۂ دل اُس طرف ہے، قبلۂ جاں اِس طرف
اُس طرف اللہ کا گھر کوئے جاناں اِس طرف
لاکھ ایمانوں پہ بھاری ہے ادائے کافری
ایک کافر اُس طرف سارے مسلماں اِس طرف
حُسن محوِ رنگ و بو ہے عشق غرقِ ہائے و ہو
ہر گلستاں اُس طرف ہے ہر بیاباں اِس طرف
سانس میں آوازِ نے ہے دل غزل خواں ہے ذہین
شاید آنے کو ہے وہ جانِ بہاراں اِس طرف



چھایا ہے یوں ہم اہلِ نظر پر سرورِ عشق
چہروں پہ انکسار ہے، دل میں غرورِ عشق

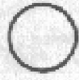
یہ اور بات ہے کہ ادب ہے شعارِ شوق
ورنہ ظہورِ حُسن ہے شانِ ظہورِ عشق

یہ پیچ و تابِ عشق ہے خود آب و تابِ حُسن
جلوہ فشاں ہے طورِ تجلّی پہ طورِ عشق

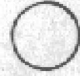
خود صاحبِ جمال ہے خود طالبِ جمال
طالب نہیں ہے غیر کی طبعِ غیورِ عشق

وارستۂ زمان و مکاں عشق کی نگاہ
حاضر ازل سے تا ابد ہے حضورِ عشق

آئے نظر خدا ہی خدا ہر طرف ذھینؔ
میری طرح پیے کوئی جامِ طہورِ عشق



لاموجودُ غیرَ الحق — غیرِ حق زق زق بق بق
چشمِ حق ہے سوئے حق — دیکھ! مقید میں مطلق
ایک دمک سے مکھڑے کی — ہوش ہیں غائب رنگ ہے فق
دل کا بیڑا پار اترا — بے کشتی و بے زورق
محض جنوں کی بے ربطی — کیا دنیا کا نظم و نسق
مہر و مہ عرش و کرسی — مصحفِ دل کا ایک ورق
حُسن کی سادہ بات ذھینؔ
فکرِ دقیق کلامِ ادق



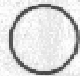
کھنچ کر سحرِ ہجر، گئی شامِ لحد تک
کیا جائے گی اب شامِ لحد، صبحِ ابد تک

ہر چیز کی پہچان ہے اس چیز کی ضد سے
نیکی ہے بدی تک، تو ہر اک نیک ہے بد تک

واحد کے اعادے سے ہے موہوم تعدّد
صرف ایک عدد دیکھ، نہایاتِ عدد تک

یہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھولوں کی بہاریں
جو پھیل گئیں دامنِ گلچیں سے سبد تک

معصوم گناہوں سے ذہین اہلِ جنوں ہیں
یہ بات پہنچ جائے نہ اربابِ خرد تک



نہ الفاظ پہنچیں نہ معنیٰ وہاں تک
کہوں حُسن کی حد کہاں سے کہاں تک

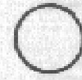
بہت دور ہیں اصلیت سے فسانے
بڑا فاصلہ ہے دلوں سے زباں تک

گزر جا محبت میں بیم و رجا سے
محبت میں خامی ہے سود و زیاں تک

اُسی سے امیدِ نوازش ہے دل کو
ہنسی میں اڑا لے گیا جو فغاں تک

دعا لب پہ آتی ہے دل سے نکل کر
زمیں سے پہنچتی ہے بات آسماں تک

ذہین آج آفاق بن کر عیاں ہے
جو اک حرف آیا تھا میری زباں تک



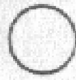
تیرے در کے فقیر ہیں ہم لوگ
کیا امیر و کبیر ہیں ہم لوگ

دونوں عالم کی قید سے آزاد
ایک تیرے اسیر ہیں ہم لوگ

حسن و خوبی میں بے مثال ہیں آپ
عشق میں بے نظیر ہیں ہم لوگ

دل میں رکھتے ہیں چاند سی صورت
کیا ہی روشن ضمیر ہیں ہم لوگ

سر برہنہ ذھین خاک نشین
اہلِ تاج و سریر ہیں ہم لوگ

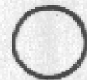


رنجِ فرقت نہ اب نشاطِ وصال
ہو گئے واقعات خواب و خیال

اب نہ مسرور ہوں نہ میں مغموم
تھی خوشی بھی خیال، غم بھی خیال

وہ ستمگار اور ترکِ ستم
میں ستم دیدہ اور ترکِ ملال

اے ذھین آ گئے وہ بالیں پر
شکر ہے ہو گیا بخیر مآل



قلبِ آغوشِ تمنائے جمال — آئینہ چشمِ تماشائے جمال

گم ہوا، آئینہ عکسِ حسن میں — عکس محوِ نقشِ زیبائے جمال

نقشِ زیبا التفاتِ حسن ہے — حسنِ خود بیں نقش آرائے جمال

آئینہ صورت ہے، صورت آئینہ — اور پھر دونوں تجلائے جمال

کیا ہے قسمت کا سکندر آئینہ — جلوہ دارِ حسن، دارائے جمال

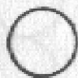
صورت و ذی صورت آئینہ میں ایک — یہ دوئی میں شانِ یکتائے جمال

ناظر و منظور اس مشہد میں ایک — کائناتِ عشق، دنیائے جمال

میری آنکھیں کیا ہیں؟ آئینہ: ذہین

آئینہ کیا؟ چشمِ بینائے جمال

کراچی ۱۲ر اپریل ۱۹۷۵ء



قبلہ و کعبہ الم ہیں ھم — ہاں الف، لام، میم ہم ہیں ہم

ہم پہ قرآنِ عشق اترا ہے — مرسلانِ خدائے غم ہیں ہم

اور اللہ کا کرم کیا ہے — آپ اللہ کا کرم ہیں ہم

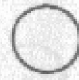
آپ بتخانۂ صفات اپنے — جلوۂ ذات کا حرم ہیں ہم

کچھ زیادہ نہ کچھ کسی سے کم — دور از فکرِ بیش و کم ہیں ہم

تخت ہے دہر ہم ہیں تخت نشیں — جام ہے کائناتِ جم ہیں ہم

دیدۂ دل سے دیکھ ہم کو ذہین

اس زمانے میں مغتنم ہیں ہم



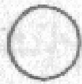
وصل میں ہجرِ یار کا عالم
قرب میں انتظار کا عالم

ہر خرابی میں صورتِ تعمیر
ہر خزاں میں بہار کا عالم

خواب میں جیسے خواب کی تعبیر
عالمِ اعتبار کا عالم

عشق تنہا خزاں کا عالم ہے
حسنِ تنہا بہار کا عالم

زلف و رُخ سے ذہین ہے آباد
دل میں لیل و نہار کا عالم



دلِ یزداں کی تمنّائے جواں ہے عالم
غور سے دیکھ، یہاں ہے سو وہاں ہے عالم

یہ جو آنکھوں میں ہے آنکھوں سے نہاں ہے عالم
نظر آتا ہے کہاں اور کہاں ہے عالم

جلوۂ عالمِ بے نام و نشاں ہے عالم
تو سمجھتا ہے زماں اور مکاں ہے عالم

کم نگاہی اسے مطلوب سمجھ بیٹھی ہے
ورنہ خود طالبِ صاحب نظراں ہے عالم

نظر آتا ہے مجھے جلوۂ حق ہر شے میں
تو یہ کہتا ہے فقط وہم و گماں ہے عالم

عالمِ خواب میں بیدار ضمیرِ فطرت
نگراں آپ ہے جیسے نگراں ہے عالم

حُسنِ وحدت ہے یہی جلوہ گہِ وحدتِ حُسن
کثرتِ نام و نشانِ دگراں ہے عالم

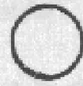
کیوں کہیں ہر کس و ناکس سے وہ چشم و ابرو
جن اشاروں پہ رواں اور دواں ہے عالم

دونوں عالم میں ہے بس ایک ترے دم کا ظہور
تو نہیں ہے تو یہاں ہے نہ وہاں ہے عالم

ایک پردہ جو اٹھایا تو گرے تو بر تو پردے
فاش ہو کر بھی مگر رازِ نہاں ہے عالم

عشق کی آنکھ میں آئینۂ محبوب ہے یہ
عقل کے ہاتھ میں اک سنگِ گراں ہے عالم

سر بسر جلوہ گہِ حُسنِ حقیقت ہے مگر
سر بسر جلوہ گہِ نازِ بُتاں ہے عالم



ہوا تیرے نہ ہونے سے یہ عالم
کہ عالم ہو گیا ہے عالمِ غم

تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم
نثارِ پرتوِ خورشید شبنم

خوشی سے دُور ہو سکتا ہے کب غم
ہنسی میں بھی مری آنکھیں ہیں پُرنم

ہوا جس وقت برہم نظمِ عالم
بہت یاد آئے وہ گیسوئے برہم

نکل کر ہم سے چھپ جاتا ہے ہم میں
نہیں عالم سے ہم، ہم سے ہے عالم

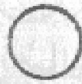
سکونِ قلب کی غارت گری میں
محبت بھی نہیں کچھ حسن سے کم

گلے ملتی ہیں جو دریا میں موجیں
یہی اک موج تم ہو دوسری ہم

من و تو سے محبت ماورا ہے
نہ تم، تم ہو حقیقت میں نہ ہم، ہم

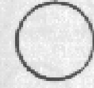
جہانِ کیف و کم میں جلوہ گر ہیں
ہزاروں عالمِ بے کیف و بے کم

وہ دیکھیں آئینہ، ہم ان کو دیکھیں
خدا کا آئینہ ہے قدِ آدم



وہ ماہِ طلعت و زہرہ جبین کون ہے؟ تم!
ز فرق تا بقدم نازنین کون ہے؟ تم!
متاعِ قلب و نظر کی امین کون ہے؟ تم!
تمام حسن، سراپا حسین کون ہے؟ تم!
نمودِ لالہ و گل میں جو مسکراتا ہے
وہ گل نشین کون وہ غنچہ نشین کون ہے؟ تم!
سجودِ کعبۂ ہستی ہیں کس کے قدموں پر؟
بتاؤ حاصلِ ایمان و دین کون ہے؟ تم!
جہاں فریبِ گماں ہے، گماں فریبِ جہاں
یقین کون ہے حسنِ یقین کون ہے؟ تم!

جمالِ حسن سے سرشار آج کون ہے؟ میں!
ملالِ عشق سے اندوہگین کون ہے؟ تم!



مجھ سے ہی ظاہر مجھ میں ہی پنہاں
دل ہے کہ دلبرِ جاں ہے کہ جاناں

حسن آج محزوں عشق آج شاداں
بلبل غزلخواں، گل چاک داماں

دل ہو کہ گیسو سلجھے نہ سلجھیں
وہ بھی پریشاں ہم بھی پریشاں

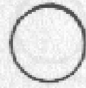
آنکھوں کے روزن روشن ہیں ورنہ
انساں سراپا تاریک زنداں

دل ایک اُس کے دُشمن ہزاروں
سو جان لیوا اور ایک انساں

حُسن ایک دریا عشق اس کی موجیں
دریا سے باہر موجیں نہ طوفاں

بخیہ گری کو آیا ہے ناصح
دامن سے ان کے سی دے گریباں

باتیں ذہینِ تاجی ہماری
مشکل ہی مشکل آساں ہی آساں



جراحتِ دل و زخمِ جگر کے ساتھ رہوں
نظر ملی ہے تو ان کی نظر کے ساتھ رہوں

دل و نگاہ میں ہے اک رفیق ایک رقیب
میں دل کے ساتھ رہوں یا نظر کے ساتھ رہوں

یہ تیری زلف کی راتیں یہ دن ترے رخ کے
اب اور کون سی شام و سحر کے ساتھ رہوں

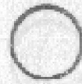
کبھی ہوئی نہ اجازت ترے تبسم کی
کہ دو گھڑی کے لیے چشمِ تر کے ساتھ رہوں

نظر کے حق میں غنیمت ہیں چند جلوے بھی
مگر یہ دھن ہے کہ میں جلوہ گر کے ساتھ رہوں

نظر نواز مناظر نہ لوٹ لیں سرِ راہ
بس آنکھ بند کیے راہ بر کے ساتھ رہوں

چمن میں آتشِ گل سے نہ جل سکے خس و خار
مجھے یہ حکم ہے برق و شرر کے ساتھ رہوں

خدا ہی خود پرِ پرواز ہے ذہین مرا
میں جبرئیل ہوں جو بال و پر کے ساتھ رہوں



اب حسن کی محفل آرائی ہے خلوتِ عشق تنہا میں
وہ دریا مجھ میں ڈوب گیا میں ڈوبا تھا جس دریا میں

اک اپنی نظر ہی کیا بدلی ہے دُنیا کی دنیا بدلی ہے
صحرا کو بستی میں دیکھا، بستی کو دیکھا صحرا میں

عیسیٰ عیسیٰ مریم مریم عصمت ہی عصمت ہے، عالم
اے عفتِ عشق! احرم ہی حرم ہے کفرِ شبابِ کلیسا میں

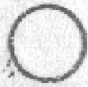
وہ روئے منور دل پرور وہ زلفِ معنبر تا بہ کمر
وہ شام ہی شام سحر ہی سحر ہر دیدہ و دل کی دنیا میں

شادابیٔ رخ مستیٔ نظر جنت جنت کوثر کوثر
جلوہ جلوہ منظر منظر ڈوبا ہوا حسنِ رعنا میں

یہ سحر ہی سحر فسوں ہی فسوں یہ کیف ہی کیف سکوں ہی سکوں
جو تیری مست نظر میں ہے وہ کب ہے شیشہ و مینا میں

ہر حسن ہے حسنِ نظر اپنا ہر جلوے میں خود ہوں جلوہ نما
میں دیکھ رہا ہوں منہ اپنا آئینہ روئے زیبا میں

وہ حسن ہی حسن سکوں ہی سکوں وہ عشق ہی عشق جنوں ہی جنوں
دنیا کی نظر سے دور ذھین اک دنیا ہے اس دنیا میں



دو جہاں جلوۂ جاناں کے سوا کچھ بھی نہیں
ہم نے کچھ اور نہ دیکھا تو خطا کچھ بھی نہیں

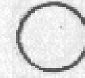
کچھ نہ ہونے کے سوا دارِ فنا کچھ بھی نہیں
ہے اگر کچھ تو یہاں غیرِ خدا کچھ بھی نہیں

عشق ہر آن نئی شانِ نظر رکھتا ہے
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کچھ بھی نہیں

زندگی سیلِ مسلسل ہے رواں اور دواں
موج و گرداب و تلاطم کی خطا کچھ بھی نہیں

متفق عشق سے اس بات میں ہے عقل ذھین
درد ہاتھ آئے تو سب کچھ ہے دوا کچھ بھی نہیں

۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء



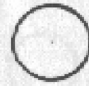
یہ آسماں ، یہ مہ و مہر، یہ ستارے ہیں
ہمارے ہاتھ نہ آئیں تو کیا ہمارے ہیں

نیازِ عشق ہے خود نازِ حسن کا طالب
ہمارے تم نہ سہی ہم مگر تمہارے ہیں

کہیں نقاب نہ اٹھے خوشی کے چہرے سے
یہاں جو خوش نظر آتے ہیں غم کے مارے ہیں

ہر اک حصول کا انجام ترک ہے یعنی
زیادہ جیتنے والے زیادہ ہارے ہیں

ذھین ہم کو نہیں شکوۂ تہی دستی
وہ جن کے ہاتھ میں سب کچھ ہے وہ ہمارے ہیں



یہ دل بھی اب نہیں ہے دل یہ آنکھیں بھی نہیں آنکھیں
یہ دل عرشِ خدائے حُسن ہے رُوح الامیں آنکھیں

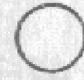
وہ رازِ عشق جو کہنے میں آیا تھا نہ آئے گا
بھری محفل میں اہلِ دل سے کھلکر کہہ گئیں آنکھیں

نظر ان کی پڑی دل پر کہ آنکھیں کھل گئیں دل کی
نہ دیکھیں ہم نے ان آنکھوں سے ایسی دلنشیں آنکھیں

ہوئیں جب چار آنکھیں ایک ہی منزل پہ جا پہنچیں
مری حُسن آفریں آنکھیں تری عشق آفریں آنکھیں

ہزار ایمان قرباں عشق کی کافر نگاہی پر
مرا ایمان و دیں ہیں دشمنِ ایمان و دیں آنکھیں

ذھین اللہ والے چومتے ہیں میری آنکھوں کو
محبت نے عطا کی ہیں مجھے وہ پاک بیں آنکھیں



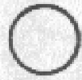
شرمندہ نقشِ پا سے خجل چشم و مہر سے میں
بچ بچ کے چل رہا ہوں تری رہ گزر سے میں

مستی برس رہی ہے در و بام سے ہنوز
گزرا تھا کیفِ عشق میں ہو کر جدھر سے میں

شاید ہے عشق ترکِ حصول و حصولِ ترک
صحرا میں گھر بنانے کو نکلا ہوں گھر سے میں

تم دیکھتے ہو آپ کو میری نگاہ سے
اور دیکھتا ہوں خود کو تمہاری نظر سے میں

معراج پا رہا ہوں محبت میں اے ذہین
اپنی نظر ملا کے کسی کی نظر سے میں



رات دن اشکباریاں کیوں ہیں
ہر گھڑی بے قراریاں کیوں ہیں

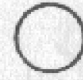
کیوں کسی کا وہ ذکر و فکر نہیں
یہ فراموش کاریاں کیوں ہیں

کیوں نہیں ہے زباں پہ دل کی بات
اس قدر راز داریاں کیوں ہیں

ہوش پر ہنس رہی ہے بے ہوشی
کس سے ہیں پردہ داریاں کیوں ہیں

یہ تری آرزو، یہ شوقِ طلب
عشق میں خام کاریاں کیوں ہیں

ہنس کے مجھ سے وہ کہہ رہے ہیں ذہین
اس قدر بے قراریاں کیوں ہیں



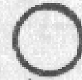
مٹائیں صبر دل سے صبر کی تلقین فرمائیں
سکونِ دل وہی چھینیں وہی تسکین فرمائیں

محبت میں زبوں حالی کی وہ تزئین فرمائیں
وہ غم دیں، ضبطِ غم کی داد دیں، تحسین فرمائیں

مجازِ عشق کی دشواریاں شاید حقیقی ہیں
وہ سُن سُن کر دعائیں ورنہ کیوں آمین فرمائیں

سکونِ حسن جانے، اضطرارِ عشق کیا شے ہے
تلوّن کیا ہے، اس کو صاحبِ تمکین فرمائیں

ذہین اس میں خود ان کے حسنِ کامل کی اہانت ہے
بھلا وہ اور میرے عشق کی توہین فرمائیں



تجھے کچھ کرامات اپنی دکھائیں
ترے دل میں ہم غیر بن کر سمائیں

بنانے کو اپنا بنا کر دکھائیں
ہمارا ہی پردہ ہمیں کیوں اٹھائیں

محبت کی دنیا میں یہ فاقہ مستی
نہ آنسو کہ پی لیں نہ غم ہے کہ کھائیں

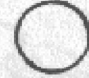
تمہارے سوا کچھ بھی دل میں نہیں ہے
نہ مانو تو کیا چیر کر دل دکھائیں

نہیں حسن سے کم جمالِ محبت
جو ہم دیکھتے ہیں تمہیں کیوں دکھائیں

انھیں لاکھ پردوں میں چھپنا نہ آیا
جو پردہ کریں سامنے تو نہ آئیں

تمہیں پھر بھلانے کی کوشش کریں گے
ذرا آپ اپنے کو ہم بھول جائیں

ذہین اپنی ہستی کی بستی ہے سب کچھ
کہیں گھر سے باہر ہم آئیں نہ جائیں



یہ راز دل میں چھپائیں کہ آشکار کریں
انھیں کو آپ ستاتے ہیں جن کو پیار کریں

تری تلاش میں صحرا کو لالہ زار کریں
شگفتہ پاؤں کے چھالوں سے خارزار کریں

اک التفاتِ مسلسل ہے مدعائے جنوں
کرم نہیں تو ستم ہی وہ بار بار کریں

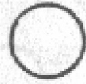
خود اختیار نہ بے اختیار دیوانے
جو آپ چاہیں وہی بات اختیار کریں

مقامِ شوق سے آگے نکل گیا ہے جنوں
وہ آئیں تو مرے آنے کا انتظار کریں

یہ دیکھنا ہے سرِ حشر رحمتیں ان کی
گناہ گار کو بخشیں کہ شرمسار کریں

نگاہِ ناز کی موجوں میں گھر گیا ہے دل
اب اس کو چاہیں ڈبوئیں وہ چاہیں پار کریں

نظر پہ بس ہے، نہ دل پر ذہین قابو ہے
کسے مزاج شناسِ نگاہِ یار کریں



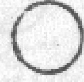
دل کو شیشہ کہوں، آنکھوں کو میں پیمانہ کہوں
آپ میخانہ بنوں، پھر تجھے میخانہ کہوں

پائے ساقی سے ہے ثابت قدمی مستی میں
سجدۂ شکر کو میں لغزشِ مستانہ کہوں

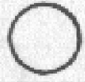
ایک ہی آگ ہے دو نام سے دو سمت لگی
شعلہ شمع کو سوزِ دلِ پروانہ کہوں

خلق سودازدۂ دیر و حرم ہے لیکن
ہے کوئی ان میں، جسے میں ترا دیوانہ کہوں؟

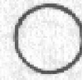
کچھ بھی دیکھا نہ گیا دیکھنے والوں سے ذہین
کیوں نہ جلووں کو حجابِ رخِ جانانہ کہوں،



ترے حُسن کے کچھ اشارے ہوئے ہیں
حسینوں کے لاکھوں نظارے ہوئے ہیں
یہ ذرّے کہیں چاند تارے ہوئے ہیں
ہم اپنی نگاہوں کے مارے ہوئے ہیں
ہم اُن کے ہوئے وہ ہمارے ہوئے ہیں
محبت سے دونوں ہی ہارے ہوئے ہیں
سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں جو طوفاں
وہ طوفاں سمٹ کر کنارے ہوئے ہیں
ہوا عشق میں جو ہوا تھا نہ ہوگا
خود اپنے نہیں وہ تمہارے ہوئے ہیں



نہیں نگاہ تو جلوے نہ جلوہ گاہ کہیں
بجز نظر نہیں حُسنِ نظر پناہ کہیں
تمہیں ملی مری کھوئی ہوئی نگاہ کہیں
وُہی نگہ کہیں جلوہ تھی جلوہ گاہ کہیں
ہزار بار تبسم لبوں سے جب رُوٹھے
تو ایک بار ہو لب آشنائے آہ کہیں
مقامِ دل وہ نہ سمجھا، جو یہ سمجھ نہ سکا
یہاں نہیں، تو نہیں ان کی جلوہ گاہ کہیں
خلوصِ عشق جزا و سزا سے مستغنی
نہ ہو ثواب کی امید بھی گناہ کہیں
جہانِ دیدہ و دل کیوں نہیں ہیں ایک ذھین
ترا خیال کہیں ہے تری نگاہ کہیں،



شبِ وصال ہے ہم ہیں کہ کھوئے جاتے ہیں
حواس و ہوش سرِ شام سوئے جاتے ہیں

خوشا جمالِ محبت، جنوں کے ہاتھوں سے
خرد کی مانگ میں موتی پروئے جاتے ہیں

جمالِ یار کی موجوں میں کیف کی خاطر
دل و نظر کے سفینے ڈبوئے جاتے ہیں

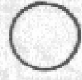
وہ مجھ کو دیکھ رہے ہیں ہزار پردوں سے
یونہی حجاب میں جلوے سموئے جاتے ہیں

نگاہِ دیدۂ بیدار دستگیری کر
رہِ طلب میں مرے پاؤں سوئے جاتے ہیں

مجالِ عشق، محالِ خرد نہ بن جائے
تمہارے ڈھونڈنے والے ہی کھوئے جاتے ہیں

نہ جانے آج انھیں کیا ہوا کہ میری طرح
جو بات بات پہ ہنستے تھے روئے جاتے ہیں

خودی کو کھو کے جنھیں پالیا ہے میں نے ذہین
مرے وجود میں آکر وہ کھوئے جاتے ہیں



وہ ہر دل کو اپنا بنانا بھی چاہیں
وہ ہر دل کو لیکن ستانا بھی چاہیں

انھیں حالِ دل ہم سنانا بھی چاہیں
وہ پوچھیں تو اُن سے چھپانا بھی چاہیں

وہ پاس آئیں تو دُور جانا بھی چاہیں
اگر دُور ہوں پاس آنا بھی چاہیں

جو ہنستے ہوں ہم، وہ رُلانا بھی چاہیں
جو رونے لگیں تو ہنسانا بھی چاہیں

اٹھا کر وہ پردے گرانا بھی چاہیں
وہ پردے گرا کر اٹھانا بھی چاہیں

محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ

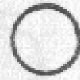
نہ بھولیں اگر بھول جانا بھی چاہیں

مرے حال پر رحم بھی اُن کو آئے
مجھے دیکھ کر مسکرانا بھی چاہیں

وہی چھین کر لے گئے ہوش مجھ سے
وہی ہوش میں مجھ کو لانا بھی چاہیں

یہاں یاس و امید میں ہے توازن
وہ آنا بھی چاہیں نہ آنا بھی چاہیں

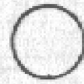
مری شاعری سے ذہین اُن کو وحشت
مرے شعر وہ گنگنانا بھی چاہیں



خدا جانے کیا گُل کھلائیں بہاریں ۔۔۔ نہ آؤ اگر تم نہ آئیں بہاریں
ترے حُسن کا گیت گائیں بہاریں ۔۔۔ جہاں تو ہنسے گنگنائیں بہاریں
محبت کی پینگیں بڑھائیں بہاریں ۔۔۔ جوانی کو جھولے جھُلائیں بہاریں
اڑاتی ہیں تیری ادائیں بہاریں ۔۔۔ ذرا دل اڑا کر دکھائیں بہاریں
تم آؤ تو مستی میں آئیں بہاریں ۔۔۔ بہاروں میں سب کھِل جائیں بہاریں
قدم رنجہ فرمائیں صحنِ چمن میں ۔۔۔ کہ آئی ہیں لینے بلائیں بہاریں
جن آنکھوں میں ہو وہ بہارِ مجسم ۔۔۔ ان آنکھوں میں کیونکر سمائیں بہاریں
ترے منہ پہ کھلتا ہے بس مسکرانا ۔۔۔ کہاں منہ ہے جو مسکرائیں بہاریں
تم آکر بہاروں کی تکمیل کر دو ۔۔۔ بہاروں میں کیوں یاد آئیں بہاریں
ہر اک شاخِ گل ایک دستِ دعا ہے ۔۔۔ تجھے دے رہی ہیں دعائیں بہاریں
کھِلے خاک سے گُل ملے خاک میں گُل ۔۔۔ بدلتی ہیں کیا کیا قبائیں بہاریں
وہ آنکھیں کہ میخانے ان پر تصدق ۔۔۔ وہ عارض کہ قربان جائیں بہاریں

فنا میں ذہین آہ ذکرِ بقا کیا
خزاں میں بھی کیوں یاد آئیں بہاریں

۲۲ مئی ۱۹۵۹ء



سر بسجود جب سے ہوں کعبۂ حسنِ ذات میں
میری نظر ہے غزنوی بت کدۂ صفات میں

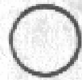
کعبہ و دیر، کفر و دیں، کیش و رسوم، مہر و کیں
دیکھ تعیناتِ وہم ، وہمِ تعیّنات میں

تازہ صنم تراش کر ، تازہ خدا تلاش کر
کام نئی نظر سے لے دل کی نئی حیات میں

عالمِ آب و گل میں کیا عالمِ دل سمائے گا
مجھ میں یہ کائنات ہے میں نہیں کائنات میں

فہم میں بھی نہ آسکے وہم میں بھی نہ آسکے
ہوتی ہے ایسی بات بھی آپ کی بات بات میں

کیا یہ نگاہ کی حدیں دل کی حدوں سے آملیں
میری تجلیاں بھی ہیں تیری تجلیات میں



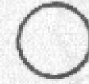
جلوہ اسیرِ بے نگہی و نظر نہیں
اب چشم بند و دیدۂ وا معتبر نہیں

تجھ کو رَوا تجلئ بارِ دگر نہیں
میرے لئے درست مکرر نظر نہیں

میں اور کچھ نہیں، تری زلفِ دراز سے
وہ رات مانگتا ہوں کہ جس کی سحر نہیں

نظارۂ جمال ، محالِ نظر نہ جان
یہ اور بات ہے کہ محالِ نظر نہیں

اپنا خیال بھی نہیں آتا کبھی ذھین
دل میں سوائے دوست کسی کا گزر نہیں



عشق ہے جس مقام میں کوئی بھی دوسرا نہیں
میں بھی ترے سوا نہیں تو بھی مرے سوا نہیں

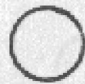
عقل کی مصلحت سہی عشق کا مدعا نہیں
دل نہ قبول کر سکے ایسی دعا، دعا نہیں

قصد نہیں، طلب نہیں، رہ نہیں، رہنما نہیں
عشق ہے خود ہی مدعا، عشق میں مدعا نہیں

نقشِ سجود ہر طرف، نام کو نقشِ پا نہیں
منزلِ عشق سر ہوئی ایک قدم چلا نہیں

عالمِ کیف و کم سے دور، محو ہے دل ترے حضور
رنج نہیں، خوشی نہیں، درد نہیں، دوا نہیں

شرحِ دل و نظر ذہین سرِ زبانِ عشق ہے
لفظ نہیں، بیاں نہیں، صوت نہیں، صدا نہیں



بہارِ باغِ گلستانِ سرمدی ہم ہیں
خدا کے ساتھ ہیں دائم وہ آدمی ہم ہیں

وہ بے خودی کہ حقیقت میں ہے خودی ہم ہیں
نیازِ بندگی و نازِ خواجگی ہم ہیں

جس انجمن میں دلوں کے چراغ جلتے ہیں
اس انجمن میں چراغوں کی روشنی ہم ہیں

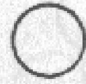
مثالِ برقِ تمنا، بہ رنگِ آتشِ شوق
یہ آگ جو ہے دلوں میں لگی ہوئی ہم ہیں

ہے ایک آنکھ میں سورج تو ایک آنکھ میں چاند
تغیراتِ شب و روز سے بری ہم ہیں

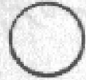
خجل ہے نورِ محبت سے ظلمتِ نفرت
جو شمع تند ہوا نہ بجھ سکی ہم ہیں

یہ واقعہ ہے کہ سب کچھ ہے تو ہی تو اے دوست
یہ اور بات کہ جو کچھ ہے تو وہی ہم ہیں

بہت بڑے ہیں حقیقت میں ہم ذہین، مگر
رہِ مجاز میں سب سے بڑی کمی ہم ہیں



نہ جلووں کی کثرت میں بہکیں نگاہیں
کہ ہیں ہر قدم پر تری جلوہ گاہیں
پڑیں جب سے دل پر تمہاری نگاہیں
کھلیں زندگی کی نئی شاہراہیں
ہماری نگاہیں فقط حسنِ عنواں
محبت کا افسانہ ان کی نگاہیں
اس انداز سے وہ چھپے جا رہے ہیں
مرے سامنے جیسے آنا ہی چاہیں
بظاہر وہ تسکین فرما رہے ہیں
مگر اور کچھ کہہ رہی ہیں نگاہیں
یہ دل تھا کہ آہوں پہ اترا رہا تھا
ہنسی میں اڑا لے گیا کوئی آہیں
نہ آس اپنے بس میں نہ یاس اپنے بس میں
وہ آنا بھی چاہیں نہ آنا بھی چاہیں
ذہین اپنے ہست و عدم سے یہ پوچھیں
اگر ہیں تو کیا ہیں نہیں ہیں تو کیا ہیں



دیکھا تمہیں حجاب اٹھا کر حجاب میں
پایا تمہیں نقاب الٹ کر نقاب میں
پنہاں شرابِ کیف ہے کیفِ شراب میں
عریاں شبابِ حسن ہے حسنِ شباب میں
ہم اہتمام جلوہ گری میں شریک ہیں
زیرِ نظر ہماری نظر بے نقاب میں
اندیشۂ خودی ہے کہ تعمیرِ بے خودی
ہوتا ہے جو خیال میں آتا ہے خواب میں
وعدہ مجھے یقینِ وفا ہے کہ یاس ہے
کیا ہے کہ پا رہا ہوں کمی اضطراب میں

تکرار ناروا ہے تجلی میں، اس لئے
پھر خواب میں نہ آئے جو آئے تھے خواب میں

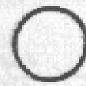
بے خود نواز حسن کی خودداریاں تو دیکھ
وہ میرے خواب میں ہے خود اپنے ہی خواب میں

سوئے ہوئے جنوں کو جگا کر چلے گئے
آئے تھے خواب سے وہ جگانے کو خواب میں

دل کچھ سکون مانگ رہا تھا کہ عشق نے
پھر تجھ سے تجھ کو مانگ لیا اضطراب میں

ان کو بھی ہر سکون سے محروم کر دیا
یہ اضطراب بھی ہے کوئی اضطراب میں؟

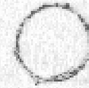
ہر شے میں دیکھتا ہوں ذہین انکو جلوہ گر
کیا چیز پیش کیجیے ان کے جواب میں



سب میں ہوں اور میں کسی میں نہیں — بزم میں بھی ہوں بزم ہی میں نہیں
میں بھی ہوں، تم بھی، دورِ ساغر بھی — کونسی بات بے خودی میں نہیں
دل کو اس دورِ آب و گل میں نہ ڈھونڈھ — آدمیت ہی آدمی میں نہیں
خاکِ گلشن عزیز ہے مجھ کو — قید لو، قیدِ رنگ ہی میں نہیں
جانے یہ کون سا مقام آیا — فرق کچھ غم میں اور خوشی میں نہیں
مہر و ماہ و نجوم و گل دیکھے — تجھ میں جو بات ہے کسی میں نہیں
ایک تیری نظر کے دو رُخ ہیں — فرق موت اور زندگی میں نہیں
میکدے میں خبر ہے یہ مشہور — آگہی، قیدِ آگہی میں نہیں

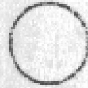
غم میں جو کیف مستقل ہے ذہین
وہ ہنسی میں نہیں خوشی میں نہیں

کراچی ۱۱ اگست ۱۹۶۱ء



تری محفل میں ہم کھوئے ہوئے سے پائے جاتے ہیں
یہاں ہم ہوش میں آتے نہیں ہیں لائے جاتے ہیں
قریبِ جلوہ گاہِ یار گیا ہم آئے جاتے ہیں
دھڑکتا جارہا ہے دل قدم تھرائے جاتے ہیں

نویدِ قرب ہے میرے لئے، مجھ سے گریز اُن کا
وہ بےگانہ نگاہی سے مجھے اپنائے جاتے ہیں
زباں سے کہہ رہے ہیں، ہم تمہارے ہو نہیں سکتے
نگاہوں سے مگر وہ اور کچھ فرمائے جاتے ہیں
سمجھ میں آ نہیں سکتی ہے کوئی بات بھی اُن کی
نگاہوں سے ہمیں ہر بات وہ سمجھائے جاتے ہیں
نہیں اپنے، تو اُن کے نام پر کیوں پیار آتا ہے
ہمارا نام سنتے ہی وہ کیوں شرمائے جاتے ہیں
محبت ہم کو کس منزل میں لے آئی خدا جانے
تسلی دے رہے ہیں آپ ہم گھبرائے جاتے ہیں
یہ کہہ کہہ کر ذہین اپنے دلِ مضطر کو ٹھیرایا
وہ آنے کو ہیں وہ آتے ہی ہوں گے آئے جاتے ہیں



ایک حقیقت کے دو محمل حُسن و محبت دونوں ہیں
خلوت خلوت محفل محفل حُسن و محبت دونوں ہیں

سب سے تنہا سب میں شامل حُسن و محبت دونوں ہیں
کتنے آساں کتنے مشکل، حُسن و محبت دونوں ہیں

اپنے اپنے آئینے میں دیکھتے ہیں منہ اپنا اپنا
اپنے اپنے آپ مقابل حسن و محبت دونوں ہیں

رنگِ حسن میں عشق ہے رنگیں رنگِ عشق میں حسن ہے رنگیں
اپنے اپنے رنگ میں کامل، حُسن و محبت دونوں ہیں

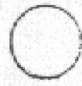
گاہے راہی گاہے رہزن گاہے رہرو گاہے رہبر
گاہے جادہ گاہے منزل حُسن و محبت دونوں ہیں

ایک حقیقت کے دو پہلو ہر پہلو میں لاکھوں پہلو
ہر جلوہ، ہر دیدہ، ہر دل، حسن و محبت دونوں ہیں

دانہ دانہ خوشہ خوشہ مزرع مزرع بجلی بجلی
خرمن خرمن حاصل حاصل حسن و محبت دونوں ہیں

آپ ہیں دریا آپ ہیں کشتی، آپ ہی کشتی بان اپنے
گا ہے طوفاں، گا ہے ساحل حسن و محبت دونوں ہیں

عشق ذھین ایمان ہے میرا حسن ہے مجھ کو جان سے پیارا
میری فطرت ہی میں شامل حسن و محبت دونوں ہیں



رُلا کر مجھ کو وہ خود رو رہے ھیں
ہزاروں شعر موزوں ہو رہے ہیں

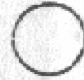
خدا معلوم کیسا ہاتھ آ رہا ہے
محبت میں جو خود کو کھو رہے ہیں

کھلیں آنکھیں تو پھر آنکھیں نہ کھولیں
وہی جاگے یہاں جو سو رہے ہیں

میری دنیا کے شاید مرنے والے
کسی دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں

نچھاور کر رہے ہیں اُن پہ کونین
کہ خود اپنے پہ قرباں ہو رہے ہیں

ذھین اسرارِ ہستی کچھ نہ پوچھو
یہ ہم بیدار ہیں یا سو رہے ہیں



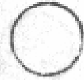
دل و نظر ترے جلووں پہ وارتے جائیں
ہم اس نگاہ کے صدقے اتارتے جائیں

تمام عمر اسی انتظار میں گذری
وہ ایک آن یہاں بھی گذارتے جائیں

زہے جنوں کہ پریشانیِ جنوں میں بھی
ہم اُن کی زلفِ پریشاں سنوارتے جائیں

وہ جب نگاہ کریں ہم بھی ایک آہ کریں
جو تیر کھائیں نہ کیوں تیر مارتے جائیں

وظیفۂ دل و جاں ہے کسی کا نام ذھین
کوئی سنے نہ سنے ہم پکارتے جائیں



چمن میں سرو و گل شرما رہے ہیں
یہ کس نے کہہ دیا وہ آ رہے ہیں

عرق آلودہ ہیں رخسارِ گلگوں
کہ پھولوں کو پسینے آ رہے ہیں

نگاہوں کی زبانی دل کے پیغام
برابر آ رہے ہیں جا رہے ہیں

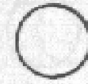
دلوں کو اضطرابِ شوق دے کر
کوئی پوچھے وہ کیوں گھبرا رہے ہیں

اب ان کی یاد بھی آتی ہے ایسے
کہ جیسے ان کو ہم یاد آ رہے ہیں

سکونِ دل اڑا کر لے گئے تھے
وہی تسکینِ دل فرما رہے ہیں

خطاب اہلِ درد سے اس انداز میں ہے
وہ جیسے مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں

ذھین ان کی طلب میں کھو گئے ہم
ہمیں کھویا ہوا وہ پا رہے ہیں



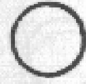
اس سے پہلے کہ دو عالم کی حقیقت جانیں
یہ ضروری ہے کہ ہم رازِ محبت جانیں

یہی اک لمحۂ ہستی ہے ازل ہو کہ ابد
کاش ہم ہستیٔ یک لمحہ کی قیمت جانیں

ایک ایک آن میں غلطاں ہیں کروروں عالم
فرصتِ عمرِ دو روزہ کو غنیمت جانیں

کیا عجب ان کی عنایت کو جفائیں سمجھیں
جو وفا کیش جفاؤں کو عنایت جانیں

ہجرِ دوزخ ہے تو جنت ہے ہمیں وصل ذہین
کیوں نہ ہم دوزخ و جنت کی حقیقت جانیں



وہ جلوے جو حجابِ ناز سے محفل میں آتے ہیں
میرے دل سے نکلتے ہیں کہ میرے دل میں آتے ہیں

شعورِ تن حضورِ جاں سرورِ دیدہ نورِ دل
وہ خود ہیں میری منزل یا مری منزل میں آتے ہیں

فنا پہلا ادب ہے شرطِ اول بزمِ جاناں میں
جو اپنے آپ سے گذریں وہ اس محفل میں آتے ہیں

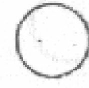
کھلی آنکھوں سے عالم پر گمانِ عالمِ دل ہے
جب آنکھیں بند کرتا ہوں نظر وہ دل میں آتے ہیں

کوئی سادہ دلئ شوق کو یہ بات سمجھا دے
پیامِ حُسن ہوتے ہیں جو ارماں دل میں آتے ہیں

خودی کے جوہر آسانی میں انساں پر نہیں کھلتے
ہم اپنے سامنے کُھل کر فقط مشکل میں آتے ہیں

ذہینِ اللہ کو میں دیکھتا ہوں حُسنِ جاناں میں
نظر خورشید کے جلوے مہِ کامل میں آتے ہیں

کراچی ۱۹۶۴ء



نظر میں ہیں وہ نظر سے کہاں گذرتے ہیں
یقیں پر ہیں کیا کیا گماں گذرتے ہیں

یہ کیا کہ کھینچتے ہیں اس ادا سے دامنِ دل
کوئی یہ جانے کہ دامن کشاں گذرتے ہیں

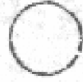
حضورِ حُسن یہ نازک نگاہیاں توبہ
کہ ہم خود اپنی نظر پر گراں گذرتے ہیں

جب ایک ذرّے کے رُخ سے نقاب اُٹھتا ہے
مری نگاہ سے ہفت آسماں گذرتے ہیں

مدارِ عقل و نہادِ خرد ہے ناکامی
جو کام کے ہیں وہ دن رائیگاں گذرتے ہیں

حیاتِ خلد بھی شاید بدل نہوان کا
ترے بغیر جو دن رائیگاں گذرتے ہیں

ذہین سوئے کمیں گاہ دیکھتا ہوں میں
اسی ڈگر سے مرے مہرباں گذرتے ہیں



کچھ نہیں یہ آمدِ فصلِ بہاراں کچھ نہیں
یہ گھٹائیں کچھ نہیں، یہ ابرِ باراں کچھ نہیں
یہ ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ پھواریں نرم نرم
یہ فضائے مست، یہ مستی کا عنواں کچھ نہیں
آبشاروں کی تبسم ریزیوں کی آڑ میں
مستقل موسیقیت کی روحِ لرزاں کچھ نہیں
وادیاں سرشارِ مستی میکدہ بردوش ہوں
ذرّہ ذرّہ ہو اگر جنّت بداماں کچھ نہیں
ہو کلیسائے چمن عیسیٰ نفس، مریم صفت
یہ اچھوتے پھول یہ معصوم کلیاں کچھ نہیں
لاکھ جامہ پارسا ہوں یہ سمین و یاسمن
یہ ریائے سادگی میں رنگ رلیاں کچھ نہیں
کچھ نہیں یہ قیس سامانی لیلیٰ ہے فریب
خوابِ مجنوں کا مرقع سنبلستاں کچھ نہیں

ہاں ! یہ قلبِ حسن کی دھڑکن یہ غنچوں کی چٹک
رنگ و بو، شوق و حیا کا عہد و پیماں کچھ نہیں

کچھ نہیں غنچہ نشیں حوروں کا فردوسِ جمال
یہ فضائے قدس کا معصوم رومان کچھ نہیں

جنتی حوروں کا برزخ یہ مہک، یہ نکہتیں
یہ مثالی جسم والے پاک داماں کچھ نہیں

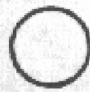
ہنس رہے ہوں گے پری پیکر گلوں کی آڑ میں
پنکھڑی کی اوٹ میں ہوگا پرستاں کچھ نہیں

فرشِ گل پر عشوۂ قدسی نژادانِ چمن
عرشِ گل پر جلوۂ ربِ گلستاں کچھ نہیں

ہو دلِ شبنم میں عکسِ ماہ و انجم جلوہ ریز
شبنمستانِ چمن ہو انجمستاں کچھ نہیں

یہ مظاہر، یہ مناظر ہیچ ہیں تیرے بغیر
ہاں یہ جناتِ نعیم و روح و ریحاں کچھ نہیں

تو بہارِ حسن ہے، تیری نظر حسنِ بہار
تو نہیں تو یہ گلستاں کا گلستاں کچھ نہیں



بہارِ جیب و داماں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں
یہ دیوانے بیاباں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

قفس کا در ہمارے پر کتر کر کھولنے والو
پروں کو ہم پریشاں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

محبت ہم کو منہ دیکھے کی پھولوں سے نہیں گلچیں
خزاں میں ہم گلستاں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

وطن کی صبحِ خنداں چھوڑ آئے ان پہ کیا ہنسنا
یہ اب شامِ غریباں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

شہیدانِ وفا کی خاک سے آواز آتی ہے
یہ ذرے کوئے جاناں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

نظر ہے روئے جاناں پر تو دل ہے زلفِ جاناں میں
نزاعِ کفر و ایماں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

یہ پروانے جنھیں ہر شمع پر جلنا نہیں آتا
تری شمعِ شبستاں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

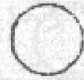
اگر منہ موڑ کر جائیں تری کافر ادائی سے
متاعِ دین و ایماں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

گلوں کا دیدۂ بے نور ننگِ رنگِ گلشن ہے
ہم اپنی چشمِ حیراں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

دمِ سرد، آہِ گرم و چشمِ تر سے دل نہ بجھ جائے
یہ شمعِ زیرِ داماں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

ذھین آتی ہے بوئے دوست تیری سانس سے ہم کو
تجھے تنہا غزل خواں چھوڑ کر آخر کہاں جائیں

۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء



آؤ حیرت کدۂ شام و سحر سے نکلیں
دُور سے دُور مقاماتِ نظر سے نکلیں

نہیں وابستۂ قیدِ در و دیوار جنوں
گھر میں بیٹھے ہوئے باہر کہیں گھر سے نکلیں

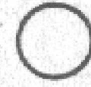
تیرے ماتھے پہ پسینہ نہیں موتی بن جائیں
وہی آنسو جو مرے دیدۂ تر سے نکلیں

چاند سورج نے نہ دیکھا ہو وہ عالم دیکھیں
دُور تر انجمنِ شمس و قمر سے نکلیں

ہر قدم منزلِ عرفانِ خرد بن جائے
عالمِ شوق میں دیوانے جدھر سے نکلیں

جب ترے پاؤں سے لپٹے ہوئے ذرے چاہیں
تو نئے چاند تری راہگزر سے نکلیں

کراچی ۱۴ اگست ۱۹۶۰ء



نازفرمائے اگر میرا جنوں — تم وہی کرتے رہو جو میں کہوں

زندگی کیا ہے سفر پیہم سفر — پھر سفر میں کیا تمنائے سکوں

عقلِ یزداں گیر، پیغمبر شکار — عشق کی فتراک میں صیدِ زبوں

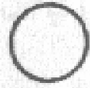
مے بقیدِ شیشہ و ساغر حرام — اور جوان مست آنکھوں سے پیوں؟

دوست عنقا ہیں تو دشمن ہی سہی — کوئی تو ہو جس کو اپنا کہہ سکوں

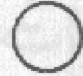
تم ہی تم ہوتے ہو میرے سامنے — سوچتا ہوں جب کبھی میں کون ہوں؟

چاہتا ہوں میں انھیں لیکن ذہین
یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کیوں؟

کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء



یہاں پیرِ میخانہ، حضرت! ہمیں ہیں
سلامت ہیں، اہلِ ملامت ہمیں ہیں
امینِ سجودِ محبت ہمیں ہیں
تری بندگی کی حقیقت ہمیں ہیں
لرزتے ہوئے کوہساروں کے آگے
اٹھالیں جو بارِ امانت ہمیں ہیں
دلِ زندہ ہر قبرِ تن سے اُٹھے گا
جو نزدیک ہے وہ قیامت ہمیں ہیں
ادھر دیکھ حق کو اگر دیکھنا ہے
خدائے محبت کی صورت ہمیں ہیں
ترے کفر و ایماں سے کیا کام ہم کو
بہر حال رحمت ہی رحمت ہمیں ہیں
محبت کسی نے کسی سے بھی کی ہو
مگر اس محبت کی غایت ہمیں ہیں
محبت خدا۔ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ہے
محبت محبت، محبت ہمیں ہیں



حسن سے قطعِ نظر عشق کی فطرت میں نہیں
اور سب کچھ ہے یہی بات محبت میں نہیں

حُسن ہر چیز پہ قادر ہے، یہ مانا لیکن
میرے دل سے وہ نکل جائیں یہ قدرت میں نہیں

دل میں وہ چاند سی صورت ہے کہ دل ناز کرے
بے نیازی مگر آدابِ محبت میں نہیں

آب و گل سے بھی ترا عالمِ دل کیا کم ہے
دل میں جو کچھ نہیں اے دوست حقیقت میں نہیں

جو تجلّی تری صُورت میں نظر آئی ہے
اس تجلّی کے سوا کچھ بھی قیامت میں نہیں

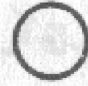
کل سرِ حشر نہ نکلے یہی جذبِ رحمت
جو کشش آج ہے دوزخ میں وہ جنت میں نہیں

کیوں نظر سے نہ گرے دل سے نہ اترے عالم
ایک صورت تھی وہ اب عالمِ صورت میں نہیں

آنکھ کا عالم دل میں ہو گذر تو دیکھے
کیا وہ صورت مری دُنیائے محبت میں نہیں

زُلف و رُخسار بیک وقت نظر میں ہیں ذھین
اب کوئی فرق یہاں غیب و شہادت میں نہیں

۱۲ مئی ۱۹۵۹ء



نہ ہو کبھی کہ رُخِ دوست بے نقاب نہ ہو
مگر نگاہ کو لازم ہے بے حجاب نہ ہو

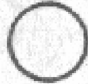
وہاں ہے حسن و محبت میں امتیاز کہاں
جہاں تکلفِ تسکین و اضطراب نہ ہو

مجھے وہ عہد شکن کہہ گئے، مجھے ڈر ہے
کہ حشر میں کہیں اُن سے یہی خطاب نہ ہو

غرورِ حسن سے فرصت کبھی ملے تو دیکھ
ترا سکون کہیں میرا اضطراب نہ ہو

اگر خرابیِ دل انتخابِ حسن ہوئی
دلِ ذہین کہیں حسنِ انتخاب نہ ہو

کراچی نومبر ۱۹۹۴ء

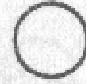


ہر تصور سے الگ ہے ہر تصور میں ہے تو
پھول سے باہر ہے بو، جو پھول کے اندر ہے بو

ہر جہت میں حسن سوزِ عشق سے محو الجہات
اب تو میں ہی میں ہوں یہ مانا کبھی تھا تو ہی تو

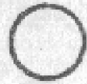
تیری بے رنگی سے نے رنگی کو نسبت دیکھ کر
احتیاطاً کھا رہا ہوں میں فریبِ رنگ و بو

کیا مجازِ بے حقیقت کیا حقیقت بے مجاز
مجھ کو تیری جستجو ہے تجھ کو میری جستجو



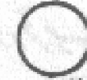
سراپا حُسن بھی تم ہو، سراپا عشق بھی تم ہو
یہ اپنی زندگی تم ہو کہ میری زندگی تم ہو
تمہارا حُسنِ کامل ہر کمی سے پاک ہے لیکن
محبت لاکھ کامل کیوں نہ ہو، اس کی کمی تم ہو
یہی دو زاویے فکر و نظر کے ہیں محبت میں
کبھی تم ہو وہی میں ہوں کبھی میں ہوں وہی تم ہو
مبارک تم کو شانِ بے نیازی اے بُتو لیکن
تمہیں نازِ محبت ہو غرورِ بندگی تم ہو
بفیضِ بُت پرستی تم ذھین اللہ والے ہو
خدا یاد آئے جس کو دیکھ کر وہ آدمی تم ہو

فروری ۱۹۶۵ء ، کراچی

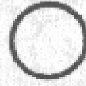


آپ قریب تو آئے ہیں کچھ اور قریب نہ آئے تو
دوری میں دل گھبراتا تھا، قرب میں دل گھبرائے تو
ایک تصوّر ہر صورت کے سانچے میں ڈھل جائے تو
جس صورت کو میں دیکھوں وہ، مجھ کو ہی دکھلائے تو
سامنے اپنے، اپنا باطن، ظاہر ہو کر آئے تو
غیب و شہادت دونوں میں جو فرق ہے وہ مٹ جائے تو
قصد و طلب کی راہ سے کوئی چل کر یافت کی منزل تک
خود کو خود ہی میں ڈھونڈے تو خود کو خود ہی پائے تو
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک، وقفۂ یک سجدہ بھی نہیں
پیشانی کے ساتھ اگر یہ کافر دل جھک جائے تو
تلقینِ ہشیاری میں بھی کیفِ سماع ملا ساقی
لیکن مست نگاہی تیری اور ہی کچھ فرمائے تو
اُن کے لب پر آجائے تو آہ امانت ہے میری
آنسو پھر بھی میرے ہونگے ان کی آنکھ میں آئے تو
آج ستم ہے ذھین ستم ہوگا یہ ستم بالائے ستم
داورِ محشر کے آگے وہ کل ہم سے شرمائے تو

مارچ ۱۹۶۵ء کراچی



نظر لوٹ کر دل میں آئے تو کیا ہو؟
جو دیکھا ہے دل میں دکھائے تو کیا ہو؟
نگاہوں سے گذرا ہوا ہے جو منظر
وہ دل سے گذرنے نہ پائے تو کیا ہو؟
خیال آپ ہی واقعہ بن گیا ہو،
یہی واقعہ پیش آئے تو کیا ہو؟
وہ تصویر جو مسکراتی ہے دل میں
تصور کو آنکھیں دِکھائے تو کیا ہو؟
وُہی! جو سمائے نہ ارض و سما میں
میرے دل میں آکر نہ جائے تو کیا ہو؟
ازل سے ابد تک کبھی آنکھ دل کی
نہ جھپکے، جھپکنے نہ پائے تو کیا ہو؟
وہ دریا کہ موجیں ہیں اس کی دو عالم
وہ اِک بوند میں ڈوب جائے تو کیا ہو؟
ذہین آپ کی چشم و ابرو کے قرباں
نہ سمجھے اشارے کنائے تو کیا ہو؟



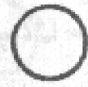
وہ میرے لئے جان سے کم ہے نہ زیادہ
وہ جان کبھی پہچان سے کم ہے نہ زیادہ
غارت گرِ دیں، رہزنِ ایماں، جسے کہیئے
وہ دین سے ایمان سے کم ہے نہ زیادہ
پہچان بُتوں کی اگر آجائے میسّر
اللہ کے عرفان سے کم ہے نہ زیادہ
دُوری میں حضوری ہے حضوری میں ہے دُوری
یہ وصل بھی حرمان سے کم ہے نہ زیادہ
تسکینِ دل وجاں ہے وہ آزارِ دل وجاں
یہ درد کبھی درمان سے کم ہے نہ زیادہ
اس کی نگہِ ناز کو دیکھا تو یہ دیکھا
وہ میری رگِ جان سے کم ہے نہ زیادہ

جو دامنِ صحرا ہے مری جیبِ جنوں میں
اک تار گریبان سے کم ہے نہ زیادہ

انکار بھی ہم معنیِ اقرار یہاں ہے
کافر بھی مسلمان سے کم ہے نہ زیادہ

ڈھونڈھے سے بھی بستی میں جب انساں نہیں ملتے
بستی بھی بیاباں سے کم ہے نہ زیادہ

سُنتا ہوں ذہین ان سے سخنہائے محبت
اک حرف بھی قرآں سے کم ہے نہ زیادہ



تھا میرے ساتھ کوئی کہ میں تھا کسی کے ساتھ
پوچھو مری خودی سے کہ تھی بے خودی کے ساتھ

عرفانِ زندگی ہو تو غم ہے خوشی کے ساتھ
آنسو بھی آ ہی جاتے ہیں اکثر ہنسی کے ساتھ

اک لمحہ زندگی کا نہ گذرا خوشی کے ساتھ
غم اصلِ زندگی ہے کہ ہے زندگی کے ساتھ

اوّل تو درد مانگنے والوں کی ہے کمی
پھر دے رہے ہیں آپ یہ نعمت کمی کے ساتھ

اپنے سوا کسی کو بھی ہم جانتے نہیں
غفلت کو جمع کیجیے خود آگہی کے ساتھ

تھا قُرب و بُعد راہِ محبت میں ایک وہم
ہم تو رہے جہاں بھی رہے آپ ہی کے ساتھ

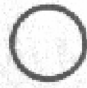
رہ کر ہمارے ساتھ رہے ہم سے آپ دُور
ہو کر جُدا بھی ہم تو رہے آپ ہی کے ساتھ

دل سے کبھی جُدا نہو وہ دردِ عشق ہے
وہ عشق کی خلش ہے جو جاتی ہے جی کے ساتھ

دل میں اگر ہے عشق تو مخلص ہے بُت پرست
ایمان بھی رہا ہے جو ہو بے دلی کے ساتھ

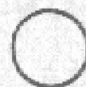
سرچشمۂ حیات، محبت ہے اے ذھین
زندہ ہے کائنات مری زندگی کے ساتھ

کراچی، ۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء پنجشنبہ



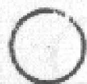
لا سکا جب نہ تابِ نظارہ — ہو گیا قلبِ ماہ نو پارہ
اس کے فیضِ نگاہ سے محروم — کوئی ثابت رہا نہ سیارہ
مہر و ماہ و نجوم چنگاری — حُسن شعلہ ہے عشق انگارہ
دورِ گردوں کو اور کیا کہیے — سخت بیہودہ گرد، آوارہ
جو گرے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے — پھر نہ چمکے فلک پہ دوبارہ
حاصلِ گردشِ مدام ہے کیا؟ — رات دن صبح شام ہموارہ
آسمانوں کی حرکتِ دَوری — دن کا جھولا ہے شب کا گہوارہ
ایک جبری نظام گردش میں — رات بے بس ہے دن ہے بیچارہ
شام کیا تیرگی کی بارش ہے — صبح کیا روشنی کا فوارہ

گردشِ چشمِ دوست کے تابع
چرخِ دوّار ارضِ دوارہ



یہ شورِ خراباتیاں توبہ توبہ — یہ شب میں سحر کی اذاں توبہ توبہ
جنوں کی خود آرائیاں توبہ توبہ — دل و دیدہ دونوں جہاں توبہ توبہ
نہیں کوئی شے درمیاں توبہ توبہ — مگر ہم کہاں وہ کہاں توبہ توبہ
ترے سامنے تیرے ہوتے ہوئے ہیں — ہماری ریاکاریاں توبہ توبہ
نہ دیکھے انھیں وہ خدا کو نہ دیکھے — تقاضائے حسنِ بتاں توبہ توبہ
خدا یاد آیا ہے مستی میں ہم کو — کبھی مے کدے میں اذاں توبہ توبہ
کبھی خوفِ عقبیٰ کبھی فکرِ بخشش — خدا سے ہیں ہم بدگماں توبہ توبہ
نہ دنیا میں بھولے نہ جنت میں بہلے — نصیبِ غمِ جاوداں توبہ توبہ
ہر اک نام میں ہر نشاں میں نمایاں — ترا نام تیرا نشاں توبہ توبہ

ذہینؔ ایک کافر کے جلووں پہ ہم نے
لٹائے ہیں دونوں جہاں توبہ توبہ



ان سے کیا کہہ گئیں خاموش نگاہیں میری
دل میں شرمندہ ہوئی جاتی ہیں آہیں میری

میری منزل نہیں کہتا تری منزل کوئی،
تیری راہوں کو تو سب کہتے ہیں راہیں میری

کیا ہی ویران ہے، بے کیف ہے، غم کی دنیا
تم ہنسی میں جو اُڑا لے گئے آہیں میری

میرے اک ہاتھ میں سورج ہے مرے اک ہاتھ میں چاند
تیری گردن میں حمائل ہیں جو باہیں میری

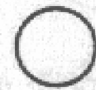
بے پناہی کے سوا حسن کا عالم کیا تھا
مل گئیں وہ تو محبت کو پناہیں میری

کس نے دیکھی تری منزل کہ ابھی دیر و حرم
دیکھتے پھرتے ہیں دیکھی ہوئی راہیں میری

نکل آیا ہوں ذہینؔ آج طلب کی حد سے
اب وہ بیٹھے ہوئے تکتے رہیں راہیں میری

جے پور - ۱۵ر جون ۱۹۴۶

BZSTRFT



آنکھیں کیوں ہیں ویراں ویراں سینہ کیوں ہے خالی خالی
ہر جلوے سے بڑھ چڑھ کر ہے کوئی تجلّی ہونے والی

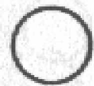
عالم کی ہر چیز ازل میں سوچی ، سمجھی ، دیکھی ، بھالی
اس بازار میں جس کے دل نے جیسی چاہی چیز اٹھالی

تم نے ہر منزل سے آگے اپنی اور بنائی منزل
ہم نے سب راہوں سے بچ کر اس منزل کی راہ نکالی

ہر جلوے میں سو سو عالم ۔ عالم عالم جلوہ جلوہ
لاکھوں عالم دل کے اندر پھر بھی دل کی جھولی خالی

حسنِ ازل کا تا بہ ابد ہے رنگ نرالا ، روپ نرالا
عشق کا ہر دم اسم نرالا ، رسم نرالی ، راہ نرالی

عشق ذھین ہے مذہب میرا عشق ذھین ہے منصب میرا
میرا بول ہمیشہ بالا ، مقصد اعلیٰ ، ہمّت عالی



درازیِ شبِ غمِ عاشقی میں راس آئی
ترے خیال سے محفل ہے کنجِ تنہائی

وہ دن گئے کہ غمِ عشق و شور و شیون تھا
وہ دور اب ہے کہ جب دل دکھا ہنسی آئی

فریبِ سود و زیاں کھل گیا محبت پر
امید و خوف سے گذرے ہیں تیرے سودائی

نگاہِ عقل سے کہتی ہے یہ نگاہِ عشق
حجابِ حُسن ، نیا طرزِ جلوہ فرمائی

یہ کیسی خفتہ و بیدار ہے چمن میں بہار
گلوں کی آنکھ کھلی تو کلی کو نیند آئی

کمالِ ترکِ تمنّا میں آگیا وہ مقام
ہمیں تھی جس کی تمنّا وہ ہے تمنّائی

ستم نہیں ہے تو کیا ہے کہ دردِ دل دے کر
کسی نے زحمتِ پرسش کبھی نہ فرمائی

مقامِ فقر ہے اپنا محلِ فخر ذھین
کہ اس دیار میں دریوزگی ہے دارائی



کچھ اس ادا سے محبت میں زندگی گذری
دل و نظر پہ جو گذری وہ خیر ہی گذری

یہ کس مقام سے عمرِ گذشتنی گذری
وہ رُخ کی دھوپ، وہ زُلفوں کی چھاؤں بھی گذری

نظر ملا نہ سکے عاشقوں سے اہلِ خرد
رہِ جنوں سے دبے پاؤں آگہی گذری

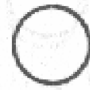
تمہاری یاد تھی یادش بخیر، دل کے ساتھ
مگر یہ چیز تو مُدّت ہوئی گئی گذری

عصائے خضر گذرگاہِ عشق میں مستی
کہ بے خودی کا سہارا لئے خودی گذری

تمہارے عارض و گیسو کے بعد نظروں سے
نہ روشنی کبھی گذری نہ تیرگی گذری

ہنسی تُلی ہے ترازوئے چشمِ پُرنم میں
حدودِ غم سے نہ باہر مری ہنسی گذری

ذہین بارگہِ دل میں زیرِ سایۂ غم
تمام عمرِ محبت ہنسی خوشی گذری



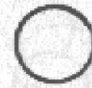
نوازشِ نظرِ گاہ گاہ بھی نہ ہوئی
اگر ہوئی مجھے تابِ نگاہ بھی نہ ہوئی

میں جانتا ہوں مجھے شوقِ دید تھا کیا کیا
اٹھا نقاب تو تابِ نگاہ بھی نہ ہوئی

وہ پوچھتے ہیں مرا حال ہائے کیا کہیے
اک آہ پر تھا بھروسہ سو آہ بھی نہ ہوئی

اک انفعال نہ ہونا تھا لاکھ جرم سہی
گناہگار کو خوئے گناہ بھی نہ ہوئی

ذہین دیر سے جائیں تو ہم کہاں جائیں
حرم کسی سے جہاں رسم و راہ بھی نہ ہوئی



غم ملا، سوز ملا، درد ملا، آہ ملی
تیرے ملنے کی کوئی ایک مجھے راہ ملی!

خضر کے پاؤں نے سو کر بھی نہ پایا ہو جسے
مجھ کو وہ دولتِ بیدار سرِ راہ ملی

بے خودیٔ عشق کی دنیا میں ہے وہ نعمتِ خاص
جو باندازۂ ظرفِ دلِ آگاہ ملی

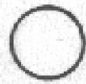
عام ہو کر بھی غمِ عشق یہاں عام نہیں
جس کو سو درد ملے رخصتِ یک آہ ملی

دل پہ نازل ہوئی بے واسطہ ہر آیتِ غم
کیا رسولوں سے بھی فرصت مرے اللہ ملی؟

یہ ترے سانس کی خوشبو ہے کہ بادِ سحری
کس سے بے ساختہ یہ آہ سحر گاہ ملی

ہر گدائے درِ جاناں کو ہے زعمِ شاہی
ہوسِ جاہ مٹا کر ہوسِ جاہ ملی

دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے دیکھا ہے ذہین
وہ سمندر ہے کہ جس کی نہ کوئی تھاہ ملی



جو بہار آئی مرے گلشنِ جاں سے آئی
خاک کے ڈھیر میں یہ بات کہاں سے آئی

وہ نظر ہے جو مشرف ہے رُخِ ساقی سے
وہ خبر ہے جو درِ پیرِ مغاں سے آئی

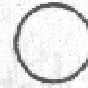
عشق منزل پہ فقط راہِ یقیں سے پہنچا
عقل، ناکام رہِ وہم و گماں سے آئی

عشقِ غم اور خوشی ایک سمجھ بیٹھا ہے
تیرے ہنسنے کی جو آوازِ فغاں سے آئی

رنگ و بو حسن و جوانی میں ہے عالم سرشار
تیرے آنے کی خبر کون و مکاں سے آئی

خاک ہوں پاک ہوں لا دینی بھی ہوں اعلیٰ بھی ذہین
خود وہ پہنچ جائے گی جو چیز جہاں سے آئی

کراچی ۲۰ مئی ۱۹۵۹ء

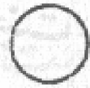


زندگی خود زندگی کی یاد ہو کر رہ گئی
یاد ہو کر رہ گئی فریاد ہو کر رہ گئی

عاشقی کیا حسن میں برباد ہو کر رہ گئی
یاد اپنی اب تو ان کی یاد ہو کر رہ گئی

غم حقیقت ہے محبت میں خوشی شاید مجاز
لب پہ آئی جو ہنسی فریاد ہو کر رہ گئی

کس قدر حسن و محبت میں ہے ربطِ باہمی
سرگذشت ان کی مری روداد ہو کر رہ گئی



تا ابد فرصتِ مستی ہے بہت کم ساقی
چل یہاں سے بھی کہیں دور چلیں ہم ساقی

عالمِ غم سے گذر کر غمِ عالم ساقی
دورِ ساغر میں طربناک ہے ہر دم ساقی

دورِ مے، دورِ سکوں میں بھی کوئی دم ساقی
تھک گئی گردشِ ایام ذرا تھم ساقی

نظمِ عالم ہے تری زلف سے برہم ساقی
عالمِ غم پہ گراں ہے غمِ عالم ساقی

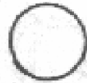
کیا اٹھے قبر سے ہم فتنۂ محشر اٹھا
جان کے ساتھ ہے شاید غمِ عالم ساقی

ہوش میں قرب یہاں منعِ مستی میں نہیں
حسنِ جنت ہے فقط لغزشِ آدم ساقی

قبر میں حشر میں جنت میں کوئی فرق نہیں
وہی میں ہوں وہی تو ہے وہی عالم ساقی

دلِ پُرخوں ہے کہ شیشہ میں مئے گلگوں ہے
ساغرِ مے ہے کہ یہ دیدۂ پُرنم ساقی

سخنِ عشق ذہین اور سنائے کس کو
حرم و دیر میں کوئی نہیں محرم ساقی



محبت رہنما اپنی محبت راہبر اپنی
ادھر نکلی تری منزل جدھر اٹھی نظر اپنی

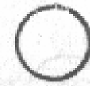
دلِ بے جذب اپنا ہے نہ آہ بے اثر اپنی
ان آئینوں میں دیکھیں وہ ادائیں جلوہ گر اپنی

کہاں سے لائے گی عمرِ دو روزہ عہدِ رفتہ کو
کہاں یادش بخیر اب شام اپنی وہ سحر اپنی

مزاجِ حسنِ خود بیں کو محبت کی نظر سمجھی
سمجھتے ہیں محبت کی نظر کو وہ نظر اپنی

کہاں ہے حسن کو مستی میں ہوشِ التفاتِ دل
وہ کیا اپنی خبر لیں گے نہیں جن کو خبر اپنی

ذہین اپنے لئے دیر و حرم دونوں برابر ہیں
جدھر سے وہ گزرتے ہیں وہی ہے رہ گزر اپنی



فطرتِ حسن ہے بے پردگی و جلوہ گری
ہر تمنائے نظر شکوۂ کوتہ نظری

تیرے ہوتے ہوئے ہر تہمتِ ہستی مجھ پر
ماتمِ کم نگہی مرثیۂ بے بصری

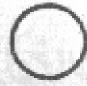
حق ترے غم کی امانت کا ادا کر نہ سکے
نالۂ نیم شبی آہ و فغانِ سحری

شکر ہے عقل کی آنکھوں سے رہی پوشیدہ
خلوتِ بے خودی و جلوہ گہِ بے خبری

عقل کہتی ہے کہ ہر جرم کا مجرم ہے یہ عشق
عشق ہر جرم سے کونین کو سمجھا ہے بری

دل سے اٹھی جو گھٹا آنکھوں سے کھل کر برسی
اسی برسات سے کھیتی ہے غمِ دل کی ہری

وہ نہ ہوں مجھ میں نمایاں تو نہوں مجھ میں ذہین
ذوقِ خودداری و خود آگہی و خود نگری



وابستۂ تصورِ جاناں ہوں آج بھی
اُس کی نگاہ کا میں نگہباں ہوں آج بھی

دلدادۂ تجلیٔ یزداں ہوں آج بھی
پروانۂ جمالِ حسیناں ہوں آج بھی

اب کوئی فرق صورت و تصویر میں نہیں
دُوری میں ہے یہ قرب، کہ قرباں ہوں آج بھی

آنکھوں میں پھر رہے ہیں ہزار آنکھ پھیر لیں
ان پیکرانِ ناز پہ نازاں ہوں آج بھی

رنگیں ہے عکسِ خندۂ رنگیں سے چشمِ تر
میں آنسوؤں کے سائے میں خنداں ہوں آج بھی

وہ جانِ رنگ و بو ہے تصور میں ساتھ ساتھ
ہر دشت میں بہارِ بداماں ہوں آج بھی

دل گا رہا ہے اُس قدِ موزوں کی دھن میں گیت
میں دل کے ساتھ ساتھ غزل خواں ہوں آج بھی

ہر لحظہ گامزن ہوں حریمِ جمال میں
کل کی طرح سفر سے گریزاں ہوں آج بھی

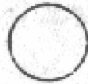
رکھا نہ بزمِ حُسن سے باہر کہیں قدم،
نظارگیٔ حُسنِ خراماں ہوں آج بھی

مدت ہوئی کہ منزلِ جاناں ہے جان میں
دل سے مقیمِ منزلِ جاناں ہوں آج بھی

ہر آن جانِ نو سے ہے زندہ جہانِ عشق
میں عشق کا مجددِ دوراں ہوں آج بھی

مَیں نے مزاجِ حسن و محبت بدل دیا
دونوں جہاں میں آپ نمایاں ہوں آج بھی

(کراچی - ۱۵ر جون ۱۹۶۵ء)



یہ کس نے دل کو صفتِ انقلاب کی بخشی
خوشی میں رنج دیا رنج میں خوشی بخشی

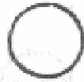
تیرے جمال نے پھولوں کو تازگی بخشی
تیرے خیال نے تاروں کو روشنی بخشی

وہ آسمانِ تصور کے چاند ہیں لیکن
زمینِ دل پہ جو اترے تو چاندنی بخشی

ملی جلی سی فنا و بقا کی لذت ہے
تری نگاہ نے مارا کہ زندگی بخشی

عطائے خاص محبت میں اور کیا ہوگی
خطائے شوق کسی نے کبھی کبھی بخشی

ہزار شکر کہ مجھ کو عطا ہوا ہے ذہین
وہ فقر جس نے گداؤں کو خسروی بخشی



نظر میں بس ہی گئے جان و دل میں رم ہی گئے
کچھ اس ادا سے وہ آئے کہ جیسے ہم ہی گئے

بہت حسین تھی بزمِ مجاز کی دعوت
ہمیں بہت ہی بلایا گیا تو کم ہی گئے

یہ راہِ عشق کسی سے کبھی آہ طے نہ ہوئی
پہنچ گئے وہ عدم میں جو دو قدم ہی گئے

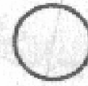
بُری بلا ہے غمِ دل نہ پوچھنے آتے
وہ ہنستے آئے تھے افسوس، چشمِ نم ہی گئے

خدا کا نام ہے باقی حرم میں لے دے کر
حرم میں اور دھرا کیا ہے جب صنم ہی گئے

کسی مقام میں اک لمحہ بھی قیام نہیں
وہ چل رہے ہیں تھمے ہی نہیں جو تھم ہی گئے

غمِ زمانہ ہے باقی نہ اب زمانۂ غم
تم آگئے تو وہ لیل و نہارِ غم ہی گئے

ہزار ہم نے بھلایا انھیں ذہینؔ مگر
نقوش ان کی محبت کے دل میں جم ہی گئے



وہ حالت ہے اب تو ان کی جو حالت ہے دیوانوں کی
دی شمع کو قسمت فطرت نے جو قسمت تھی پروانوں کی

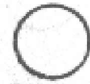
اس دل میں کیا کیا ارماں ہیں اس ارماں سوزِ محبت کے
یہ دنیا ہے ارمانوں کی یا بستی ہے دیوانوں کی

بننا ہے بگڑنے کی صورت، ہونا ہے نہ ہونے کی صورت
کاشانوں کی بنیاد پڑی تعمیر ہوئی ویرانوں کی

نامحرمِ سرِّ عشق رہے نادانی بھی دانائی بھی
اس بات سے آخر صلح ہوئی داناؤں سے نادانوں کی

ان خاک کے ذرّوں پر غافل! آہستہ چل آہستہ چل!
یہ ذرّے ہیں دل انسانوں کے یہ آنکھیں ہیں انسانوں کی

درویشِ خدامست آ نکلے کس ہستی میں اس بستی میں
ہوتی ہے ذہینؔ حقیقت سے تعبیر یہاں افسانوں کی



آرزو ہے نہ کچھ تمنا ہے
دل خدا جانے چاہتا کیا ہے

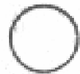
یہ سمجھتے ہیں تو برا کیا ہے
جو کچھ آئے اُدھر سے، اچھا ہے

خوش رہیں تیرے دیکھنے والے
ورنہ کس نے خدا کو دیکھا ہے

دیکھنے کی کسی میں تاب نہیں
کیا یہ جلوہ نہیں ہے، پردا ہے

کب طلب سے جُدا ہے یافت، ذھین
جس نے ڈھونڈا ہے اُس نے پایا ہے

جے پور اگست ۔ ۱۹۳۰ء



جو جلوہ گاہِ یار ہے وہ دل یہی تو ہے
ہم جس جگہ ہیں حُسن کی منزل یہی تو ہے

خود کو نہ دیکھنا ہے تجھے دیکھنے کی شرط
جو درمیاں حجاب ہے حائل یہی تو ہے

ہر ذرہ دل فریب ہے ہر جلوہ جاں نواز
ہر گام پر گماں ہے کہ منزل یہی تو ہے

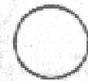
ہلکی سی ایک موجِ تبسم میں بہ گیا
جو بحرِ بے کنار تھا وہ دِل یہی تو ہے

اب ہر ادائے حُسن پہ ہوتا ہے یہ گماں
جو لوٹ لے گئی ہے مرا دل یہی تو ہے

دل مجھ سے کہہ رہا ہے ترے دل کی بات بھی
آئینہ آئینے کے مقابل یہی تو ہے

دونوں جہاں کو تیری محبت میں بھولنا
اک بات یاد رکھنے کے قابل یہی تو ہے

اے دوستو! ذھین کو پہچانتا ہوں میں
سب سے الگ جو سب میں ہے شامل یہی تو ہے



بھیس بدلے ہوئے جیسے شبِ تنہائی ہے
اس ادا سے بھی ملاقات کی رات آئی ہے

نہ تماشا ہے یہاں کچھ نہ تماشائی ہے
یہ مرے ہوش میں آنے کی خبر آئی ہے

کثرتِ حسن میں بھی عالمِ یکتائی ہے
بزم کی بزم ہے تنہائی کی تنہائی ہے

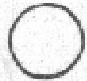
حسن غارت گرِ تمکین و شکیبائی ہے
عالمِ بے خبری میں یہ خبر آئی ہے

بے خودی میں وہ مرے سانس کی خوشبو تھی جسے
میں نے سمجھا ترے دامن کی ہوا آئی ہے

بے نیازی انھیں زیبا ہے تو اے اہلِ نیاز
سجدہ آسان ہے دشوار پذیرائی ہے

وہ تکلم وہ ترنم وہ تبسم کیا ہے
خود مرے دل کے دھڑکنے کی صدا آئی ہے

کفر کامل ہے تو ایمان بھی کامل ہے ذہین
حق شناسوں کی بتوں سے بھی شناسائی ہے



ہم نے وہ جلوے نہ دیکھے جو دکھائے نہ گئے
یہ حجابات نہ اٹھے کہ اٹھائے نہ گئے

ساتھ ساتھ اپنے لئے پھرتے ہیں ہر بزم میں وہ
واقعہ یہ ہے کہ ہم تو کہیں آئے نہ گئے

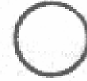
عشق میں آدم و عالم ہیں سب اللہ کے نام
کون سے نام فرشتوں سے بتائے نہ گئے

غمِ جاناں کی امانت ہیں وہ آنسو جو کبھی،
غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ میں بہائے نہ گئے

وہ بتانے سے کسی کے کبھی انساں نہ بنے
خاکِ میخانہ سے جو لوگ بنائے نہ گئے

وسعتِ دامنِ کونین کو دیکھا ہے ذہین
ان کے رخسار کے دو پھول سمائے نہ گئے

کراچی۔ ۱۴، مارچ ۱۹۶۱ء



خرد ناکام ہوتی جا رہی ہے
محبت عام ہوتی جا رہی ہے

بکھرتے جا رہے ہیں رُخ پہ گیسو
ڈھلا دن، شام ہوتی جا رہی ہے

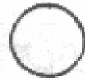
زمانہ دیکھنے کو دیکھتا ہے
نظر بدنام ہوتی جا رہی ہے

محبت، سب خلش کہتے ہیں جس کو
مجھے آرام ہوتی جا رہی ہے

ہر اک پختہ سے پختہ تر تمنّا
خیالِ خام ہوتی جا رہی ہے

ذہین اصنام کی کافرادائی
مجھے اسلام ہوتی جا رہی ہے

جے پور، ۱۸ اگست ۱۹۳۶ء



مضطرب وہ حُسن کی رنگینیاں میرے لئے
وہ جوانی صد تمنّائے جواں میرے لئے

منفعل سی وہ تیری کافرادائیں العیاذ
مضمحل سا وہ تبسم الاماں میرے لئے

شوق کی جاتی ہوئی دنیا وہ تیری خامشی
وہ سفر میں رنگِ رُخ کا کارواں میرے لئے

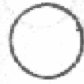
ہر نظر عہدِ حیا ہوتے ہوئے عہدِ وفا
آرزو بر دوش وہ انگڑائیاں میرے لئے

وہ عرق آلود رُخ محوِ تلافیٔ ستم
وہ ندامت ظلم سے توبہ کناں میرے لئے

ہوشیار آنکھوں میں اقرارِ قبولِ صد جنوں
بیخودِ نعم البدل خودداریاں میرے لئے

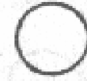
ہر ادا میں عشق کے ردِ عمل سے اضطراب
ہر نفس دامِ خلش ہائے نہاں میرے لئے

کم سمجھنا وہ زیادہ سے زیادہ التفات
وہ نوازش ہی نوازش بے نکاں میرے لئے
بے نیازانہ جنونِ عشق کا انداز آہ
بیقرارانہ وہ نازِ بدگماں میرے لئے
وہ محبت ہی محبّت حسن سر سے پاؤں تک
میری دنیا وہ زمین و آسماں میرے لئے
اب تو میں ہی میں ہوں یہ مانا تمہیں تم تھے کبھی
بلکہ گم ہے امتیازِ این و آں میرے لئے
عالمِ صورت سے اب میری نظر آزاد ہے
زحمتِ غمزہ معاف اے مہرباں میرے لئے
عشق پر کیوں عشق کی شرطِ ادب تیرے لئے
حسن پر کیوں حسن کی قیدِ گراں میرے لئے
توڑ دے قیدِ تمنّا و حدودِ امتیاز
میں جہاں تیرے لئے ہوں آ وہاں میرے لئے



تیرے جلووں کو مری آنکھ میسّر نہ ہوئی — کیا یہ محفل تری خلوت کے برابر نہ ہوئی
جب قیامت تری قامت کے برابر نہ ہوئی — تیرے ہوتے ہوئے رسوائی محشر نہ ہوئی
رہنِ گُل پیرہنی، بوئے گُل تر نہ ہوئی — جانِ بیتاب کہ آسودۂ پیکر نہ ہوئی
کیا بتاؤں ہیں پریشانیِ دل کے اسباب — کیا پریشان تری زلفِ معنبر نہ ہوئی
ہم ہوئے عشق میں سرتا بقدم ایک نظر — وہ نظر، مثلِ تجلّی جو مکرر نہ ہوئی
مضطرب حسن کو دیکھا تو یہ محسوس ہوا — اس قدر روحِ محبت کبھی مضطر نہ ہوئی
جمع ہیں عقل میں عالم کے مظاہر لیکن — عقل دیوانگیِ شوق کا مظہر نہ ہوئی

شرحِ اسرارِ محبت کہ ہے دشوار ذہین
نہ ہوئی شرح، مگر شعر سے بہتر نہ ہوئی



خزاں رسیدہ چمن کے ہر ایک ذرّے میں
دیارِ لالہ و گل شہرِ سرو و سوسن ہے

وہ جس کی خاکِ کفِ پا ہے غازۂ رُخِ دہر
ہمارے ہاتھ میں اس مہ جبیں کا دامن ہے

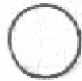
نکل سکو تو طلسمِ خیال سے نکلو!
نہ کوئی دوست ہے اپنا نہ کوئی دشمن ہے

بہار ہم سے ہے ہم صنعتِ بہار نہیں
جو ہم نہ ہوں تو نہ گل ہے یہاں نہ گلشن ہے

خلافِ راہِ محبت جو راہ دکھلائے
خدا گواہ وہ رہبر نہیں ہے رہزن ہے

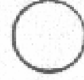
اس اتحاد میں آتی ہے اختلاف کی بو
شمیمِ زلف و نسیمِ سحر میں ان بن ہے

ذہین چاہے نظر سے نظر ملے نہ ملے
مگر ملی ہوئی دونوں دلوں کی دھڑکن ہے



ہم میں تم اور تم میں ہم، گم ہو گئے — ہوتے ہوتے ایک ہم تم ہو گئے
بن گیا سوزِ محبت سازِ حُسن — میرے نالے بھی ترنم ہو گئے
ہو گئے وہ منزلِ مقصود آپ — جو تلاشِ یار میں گم ہو گئے
کیا وہ آنسو جو مری آنکھوں میں تھے — آپ کے لب پر تبسم ہو گئے
دل سے دل آنکھوں سے آنکھیں کیا ملیں — وہ تصادم ہی تصادم ہو گئے

پر سکوں ہیں اب دل و دیدۂ ذہین
گم سفینوں میں تلاطم ہو گئے



آباد اُس میں ہم ہیں ، وہ آباد ہم میں ہے
دل ، آپ ہی حرم ہے کہ دائم حرم میں ہے

یہ سوزِ غم ہے دل میں کہ دل سوزِ غم میں ہے
اک شمع سی جلی ہوئی طاقِ حرم میں ہے

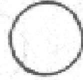
وہ لام زلف ، شرحِ الف ، لام ، میم ہے
حاصل کتابِ عشق کا لفظِ "الم" میں ہے

دنیا کی ہر خوشی مرے غم پر نثار ہے
جب سے شریک میری خوشی اُنکے غم میں ہے

کونین جس کے سایۂ رحمت میں ہیں تو ھیں
ہم میں سے ہے وہ رحمتِ کونین ، ہم میں ہے

کس بات کی کمی ہے خوشی میں ، مگر ذھین
وہ بات جو چھپی ہوئی غم میں ہے ، غم میں ہے

آیاتِ جمال

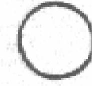


عرش و کرسی نہ سنے ارض و سما بھی نہ سُنے
یہ سُنا ہے نہ سُنیں بُت تو خدا بھی نہ سُنے

میں فقط اس سے کہوں اور کسی سے نہ کہوں
وہ کہا بھی نہ سُنے اور سُنا بھی نہ سُنے

شوق اس حد سے گزر جائے تو کچھ بات بنے
میری غیرت نہ کہے تیری حیا بھی نہ سُنے

خود ہی سنتا ہوں ذھین آج میں دل کی باتیں
اب خدا بھی نہ سُنے خلقِ خدا بھی نہ سُنے

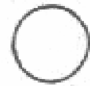


خوش تری بزم میں ہونا تھا سو ہو بھی نہ سکے
اور جی بھر کے ترے سامنے رو بھی نہ سکے

لوگ کھیتے بھی ہیں کشتی کو ڈبوتے بھی ہیں
ہم تو کھے بھی نہ سکے اور ڈبو بھی نہ سکے

طلب و یافت کے قصّوں کا خلاصہ یہ ہے
ہم اگر پا نہ سکے آپ کو کھو بھی نہ سکے

اس تصوّر میں کہ وہ خواب میں آئیں گے ذہین
ہم نے یہ چاہا کہ سو جائیں تو سو بھی نہ سکے



بے خبری میں مجھے کیفِ خبر چاہیئے
وسعتِ دِل کے لئے ذوقِ نظر چاہیئے

حُسنِ ازل! تا ابد فرصتِ جلوہ گری
ایک تجلّی مجھے بارِ دگر چاہیئے

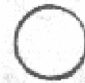
کوئی لگاتا رہے، کوئی بُجھاتا رہے
آہِ شرر بار کو دیدۂ تر چاہیئے

آنکھ جو دل کی کھُلی دید کی حسرت بڑھی
چشمِ تصور میں بھی ذوقِ نظر چاہیئے

عقل ہے بیم و رجا عشق ہے شمشیرِ لا
عشق نڈر ہو جہاں عقل کو ڈر چاہیئے

حُسن، نظر ہی نظر، عشق، سفر ہی سفر
منزلِ مقصود سے قصدِ سفر چاہیئے

اپنی نظر سے انھیں دیکھ چکے ہم ذہین
خرد کو ہے اب دیکھنا ان کی نظر چاہیئے



میں آج کہاں ہوں مرا سامان کہاں ہے
وہ جیب کہاں ہے وہ گریبان کہاں ہے

صورت نظر آتی ہے تو سیرت نظر آئے
انسان بہت ہیں، مگر انسان کہاں ہے

جس شہر کو دیکھو وہ ہے دیوانوں کی بستی
داناؤں کا گھر ہے وہ بیابان کہاں ہے

کیوں بزم میں اس کی نظر آتے ہیں مسلماں
وہ دشمنِ دیں رہزنِ ایمان کہاں ہے

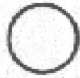
جو لمحے ترے ساتھ گذارے وہ پھر آئیں
اس عالمِ امکاں میں یہ امکان کہاں ہے

جان اُس پہ فدا جس سے نہ کچھ جان نہ پہچان
پہچان لیا میں نے مری جان کہاں ہے

وہ لوگ جو محروم ہیں عرفانِ بُتاں سے
حاصل انھیں اللہ کا عرفان کہاں ہے

بُت خانے سے کعبے میں ذہین آئے ہیں جب سے
بُت ڈھونڈھ رہے ہیں وہ مسلمان کہاں ہے

جنوری ۱۹۲۵ء کراچی



بہت برسی گھٹا چھانے سے پہلے
وہ آئے ہیں خیال آنے سے پہلے

تغافل کیش میں نے تم کو سمجھا
مگر دیوانہ بن جانے سے پہلے

مقامِ دل مقدّم ہے نظر پہ
دل آیا ہے نظر آنے سے پہلے

ذرا سلجھائیں دل کی الجھنوں کو
وہ اپنی زلف سلجھانے سے پہلے

کب آتی ہے قیامت میں بتاؤں
ترے جانے کے بعد آنے سے پہلے

بہاریں مسکراتی ہیں خزاں میں
کھلے ہیں پھول مرجھانے سے پہلے

ہنسی کی جھلکیاں ہیں آنسوؤں میں
وہ خود آتے تھے یاد آنے سے پہلے

نقاب آیا نہ آئے، ان کے رُخ پر
ہمارے ہوش میں آنے سے پہلے

ذہین اُس کی حقیقت جس نے سمجھی
نہ سمجھی میرے افسانے سے پہلے

کراچی ۱۰ مئی ۱۹۵۹ء



محبت غم ہے تو آرام کیا ہے / ہمیں آرام سے پھر کام کیا ہے

سمجھ میں دل کی باتیں کچھ نہ آئیں / نہ جانے عشق کا پیغام کیا ہے

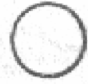
محبت ہی محبت ہے زمانہ / محبت خاص ہے تو عام کیا ہے

نگاہوں میں ہے مستی کی حقیقت / تری آنکھوں کے آگے جام کیا ہے

سفر میں زندگی کی منزلیں ہیں / نہیں تو صبح کیا ہے شام کیا ہے

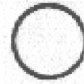
ہر اچھے نام سے ان کو پکارا / خدا معلوم ان کا نام کیا ہے

ذھین ان کے چلے جانے سے پہلے
نہ جانا عشق کا انجام کیا ہے



مری فغاں نہیں اک طرفہ راگنی سی ہے
نہیں تو کیوں خلشِ دل میں کچھ کمی سی ہے
ٹھہر سکا نہ حرم میں دلِ رمیدہ دیر
یہاں خدا کے تصور میں بتگری سی ہے
یہ راز جانتے ہیں آپ کے نگاہ شناس
غم و خوشی کی حقیقت کچھ ایک ہی سی ہے

وہی ہے حسن وہی عشق ہے ذھین مگر
نظر نظر میں تجلی نئی نئی سی ہے



خاک سے لالہ و گل، سُنبل و ریحاں نکلے
تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارماں نکلے

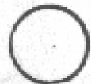
بند آنکھیں کیئے ہم منتظرِ جلوہ رہے
جب کھلی آنکھ تو خود جلوۂ جاناں نکلے

بے تکلّف مجھے آزادِ نگاہی منظور
خود تعیّن سے مگر جلوۂ جاناں نکلے

شیخ میخانے میں آنے کو مسلمان آیا
کاش میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

کیا کوئی بزمِ حسیں زیرِ زمیں اور بھی ہے
پھول کیوں چاک جگر چاک گریباں نکلے

رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے ذہین
چند اُڑتے ہوئے سائے تھے گریزاں نکلے



مصلحت حسن کو بیگانہ بنا دیتی ہے
یہ ادا عشق کو دیوانہ بنا دیتی ہے

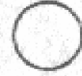
دو جہاں حرفِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
عقل اس بات کو افسانہ بنا دیتی ہے

کیا کوئی چیز ہے دنیا میں محبت کے سوا
غمکدوں کو بھی جو کاشانہ بنا دیتی ہے

عشق انسان کو انسان بنا دیتا ہے
عقل انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے

قبلۂ مستی و سجدہ گہِ مستاں وہ نظر
وہ جو میخانے کو میخانہ بنا دیتی ہے

حُسن کی ایک تجلّی کے ہیں دو نام ذہین
شمع بن جاتی ہے، پروانہ بنا دیتی ہے



یہ کیا زبانِ دوست سے جملے نکل گئے
جو التفات بن گئے قسمت بدل گئے

مستِ خیالِ یار جدھر بھی نکل گئے
زیرِ قدم شراب کے چشمے اُبل گئے

یہ کونسا مقام محبت میں آ گیا
ہم کیوں درِ رقیب پہ بھی سر کے بل گئے

تیرے بغیر وہ جو بہلتے نہ تھے کبھی
یہ کیا ہوا کہ نام سے تیرے بہل گئے

نکلا خیالِ دوست سراپا جمالِ دوست
ارمانِ عشق، حُسن کے سانچے میں ڈھل گئے

خود پر نگاہ کون کرے ان کو چھوڑ کر
ہم اپنے آپ سے بہت آگے نکل گئے

تھا ہر سطر میں جرمِ محبت لکھا ہوا
پڑھتے ہوئے ہم اپنی جو فردِ عمل گئے

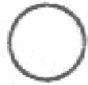
ان کا خیال ان کا تصور ہے رات دن
وہ دن بدل گئے مری دنیا بدل گئے

آوازِ دوست سے نہیں جو گوش آشنا
کہتے ہیں سازِ دہر کے نغمے بدل گئے

اکثر تمہارے ساتھ، تمہارے خیال میں
ہم عالمِ خیال سے باہر نکل گئے

لائے گئے ہیں خلد میں آئے نہیں ہیں ہم
وہ اور تھے جو خلد و جناں میں بہل گئے

گنجِ حرم سے عالمِ حورِ قصور تک
زاہد جہاں کہیں بھی گئے سر کے بل گئے
(کراچی ۱۹۹۱ء)



نظر سے آپ کا نقشِ قدم جہاں گذرے
وہ بدنصیب ہے سجدہ جسے گراں گذرے

وہ اہلِ عشق، نہ اہلِ یقیں، نہ اہلِ ادب
ترے حضور جنھیں غیر کا گماں گذرے

حضورِ پیرِ مغاں حاصلِ زمان و مکاں
جو دن یہاں نہ گزارے وہ رائیگاں گذرے

کھنچے کھنچے سے رہے جن سے تم وہ دیوانے
اگر جناں میں بھی گذرے کشاں کشاں گذرے

گلوں سے پوچھ کہ تھے کس قدر بہار افروز
وہ چند روز جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

جبینِ دیر و حرم پر ہیں کچھ نشانِ قدم
یہ دیکھتا ہوں وہ ہو کر کہاں کہاں گذرے

وہیں راہِ جنوں وہ مقام ہے جس سے
ہزار حُسن و محبت کے کارواں گذرے



جو پہچان آئے تو پہچان جائے
مجھے جان جائے تمہیں جان جائے

مرا دین جائے کہ ایمان جائے
وہ من جائے مجھ سے مری مان جائے

اگر جان جاتی ہے تو جان جائے
وہ جانِ تغافل مگر جان جائے

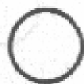
وہ انسان کے دل میں جب گھر بنائیں
کہاں گھر بنانے کو انسان جائے

یہ انکار و اقرار چھوڑو کہ ان سے
نہ ایمان آئے نہ ایمان جائے

تمہاری تمنا کو دل سے نکالیں
کہاں گھر سے باہر یہ مہمان جائے

نہ ہو تم وہاں تو جنوں سے نہ ہوگا
کہ بیٹھے بٹھائے بیابان جائے

ذہین اُن کو ان سے الگ دیکھنا ہے
جہاں وہ نہ آئیں وہاں دھیان جائے



تری محفل میں تیری ہی محبت کھینچ لائی ہے
مرا ذوقِ نظر تیرا ہی شوقِ خود نمائی ہے

تجلّی سے کبھی دل کی تسلّی ہو نہیں سکتی
کہاں یہ آنکھ مانوسِ حجاباتِ ضیائی ہے

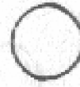
محبت سے ہر اک شے میں ہوئے آثارِ شے پیدا
محبت کی خدائی ہے محبت ہی خدائی ہے

خدائے میکدہ کیا چشمِ خواب آلودِ ساقی ہے
یہاں آتے ہی احساسِ خودی کو نیند آئی ہے

خدا یاد آ رہا ہے حسنِ ایماں سوزِ ساقی سے
کمالِ پارسائی آج ترکِ پارسائی ہے

بہاریں فرشِ رہ ہو کر بچھی جاتی ہیں گلشن میں
عروسِ صبحِ گل ہو کر جوانی مسکرائی ہے

ذہین اس دہر میں ہے مد و جزرِ زندگی اس سے
محبت سازِ دل پر جن سُروں میں گنگنائی ہے



وہ آئیں گے وہ آتے ہیں وہ آنے کو ہیں وہ آئے
تصور کو وہ بہلائیں تصور ہم کو بہلائے

وہ چمکا چاند چھٹکی چاندنی تارے نکل آئے
وہ کیا آئے زمیں پر آسماں نے پھول برسائے

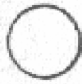
اچانک قلب دھڑکا سانس پھولی پاؤں تھرّائے
وہ ہم سے کچھ قریب آئے کہ ہم اُن کے قریب آئے

ازل سے تا ابد ہے جلوہ فرما حسنِ صد شیوہ
وہی صاحب نظر ہے جو برابر دیکھتا جائے

کہاں اِنساں کہاں عقل و خرد کی بیڑیاں، توبہ
ذرا بھی عقل ہو تو آدمی دیوانہ ہو جائے

وجودِ نور پر موقوف ہیں آثارِ ظلمت بھی
نہ ہوگی روشنی تو پھر کہاں جائیں گے یہ سائے

ذہین آسودگی راہِ طلب میں ہے زیاں کاری
ہزاروں کوس ہیں وہ دور جو اک لمحہ ستائے



وہ بدل کر بھیس میرے سامنے آتے رہے
ایک ہی تصویر ہر صورت میں دکھلاتے رہے

ہر تصوّر سے الگ، وہ ہر تصوّر سے بری
ہر تصوّر میں ہمارے سامنے آتے رہے

فرشِ گُل آیا نظر، اہلِ جنوں کو خار زار
وہ محبت کی نظر پر پھول برساتے رہے

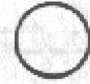
حاصلِ ترکِ خور و نوش اے بلا نوشانِ عشق
رات دن پیتے رہے آنسو تو غم کھاتے رہے

یہ ستم ہے یا کرم ہے، کیا نہیں؟ کیا ہے کہ آپ
دردِ دل دیتے رہے تسکین فرماتے رہے

عشق ہے وارفتگی میں عینِ استغنائے حُسن
ہاتھ وہ آئے ہیں یا ہم ہاتھ سے جاتے رہے

بھول کر ہم کو نہ جس نے یاد فرمایا ذہین
عمر بھر اس بے وفا کے گیت ہم گاتے رہے

فروری ۲۰۰۵ء کراچی



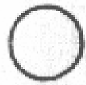
کبھی انسان سے انسان محبت نہ کرے
ہاں محبت نہیں آسان محبت نہ کرے

ہو بچانا اگر ایمان محبت نہ کرے
حُسن کافر ہے مسلمان محبت نہ کرے

جان پہچان محبت کی حقیقت سے ہو گر
جس سے کچھ جان نہ پہچان محبت نہ کرے

خیر دل کی، نہ اماں جان کی ممکن ہے یہاں
جس کو پیارے ہوں دل و جان محبت نہ کرے

یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل کوئی
کھیل سمجھا ہے جو طوفان محبت نہ کرے



خُدا کی راہ نہیں بند پارسا کے لئے
اگر بتوں کی پرستش کرے خدا کے لئے

زمانہ ساز نہیں ، وہ زمانہ سوز سہی
ترس رہا ہے زمانہ اُسی ادا کے لئے

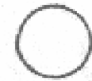
وہ درد کیا ہے جو شرمندۂ دوا ہو جائے
دعائیں مانگ کسی دردِ لادوا کے لئے

اگر سکون میسر نہیں زمانے میں
یہ فالِ نیک ہے عمرِ گریز پا کے لئے

ترا مقام ہے دنیائے آب و گل سے اُدھر
فنا ہے تیرے لئے تو نہیں فنا کے لئے

جو آپ راہ نہ جانے وہ کیا دکھائے راہ
وہ رہنما بھی ترستا ہے رہنما کے لئے

ذھین سر بگریباں ہے زعمِ بے گنہی
عطائے دوست نے بوسے میری خطا کے لئے



چمن میں کیوں پڑی ہیں رنگ و بو کی محفلیں خالی
بہارِ حسن کی حسنِ بہاراں میں کمی کیوں ہے

ترقی اور معراجِ ترقی پر سہی انساں
مگر انسانیت کی آج انساں میں کمی کیوں ہے

نئی راہیں کھلی ہیں زندگی کی فکرِ انساں پر
مگر خود آگہی کی فکرِ انساں میں کمی کیوں ہے

کہاں ہے منزلِ مقصود کیا مقصد ہے جینے کا
خود اپنی راہ دانی کی ہمہ داں میں کمی کیوں ہے

کہاں سوز و گداز ان قمقموں میں، شمع روشن کر
فروغِ عشق کی تیرے شبستاں میں کمی کیوں ہے

یہاں ہے کون سا میخوار جو جبریل سے کم ہے
کمی رُوح القدس کی بزمِ رنداں میں کمی کیوں ہے

ہنسی میں کیا اڑا کر لے گیا کوئی متاعِ غم
خدا معلوم میرے دردِ پنہاں میں کمی کیوں ہے



سکوتِ شامِ صحرا بھی خروشِ صبحِ گلشن ہے
صدائے بازگشتِ خندۂ گُل، دل کی دھڑکن ہے

اگر ہے بجلیوں سے کھیلنا تو چار تنکے چُن،
کہ خاشاکِ نشیمن میں نہاں، برقِ نشیمن ہے

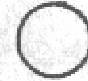
یہ ہیں اپنی ہی افتادِ نظر کے مختلف پہلو
نہ کوئی دوست ہے اپنا، نہ کوئی اپنا دشمن ہے

غرض مٹنا ہے، خود مٹ جائیں، یا کوئی مٹا ڈالے
ہم اپنے دوست کب ہیں جو ہمارا کوئی دشمن ہے

منقشِ خاطرِ سالک پہ تصویرِ خیالی ہیں
نہ جادہ ہے، نہ منزل ہے، نہ رہبر ہے، نہ رہزن ہے

ذہینؔ اب دل جلے، جلتا رہے، کچھ بھی نہیں حاصل
مگر ان کی حریمِ ناز میں اک شمع روشن ہے

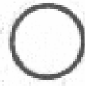
کراچی - ۱۹ جنوری ۱۹۹۲ء



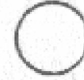
خدا سے بے وفائی کر رہا ہے — وہی کافر خدائی کر رہا ہے
ہوئے جس کام سے ہم رند بدنام — وہی زہدِ ریائی کر رہا ہے
بنا صحرا چمن، کانٹے بنے پھول — جنوں فرماں روائی کر رہا ہے
خدا سمجھے مذاقِ بے خودی کو — یہ کیا کیا خودنمائی کر رہا ہے
کھنچے تھے وہ تو کھنچ جاتی تھی تصویر — تصور بے وفائی کر رہا ہے
بڑھاتی جا رہی ہے الجھنیں عقل — جنوں مشکل کشائی کر رہا ہے
مسلّم ہے جو دل آزار، دل سوز — وہ کارِ دل رُبائی کر رہا ہے

ذہین اس فقر کا دلدادہ ہوں میں
جو شاہی میں گدائی کر رہا ہے

کراچی ۲۵ اگست ۱۹۶۱ء



اُسی سے خوش ہے دل جس سے خفا ہے
نہ جانے یہ مجھے کیا ہو گیا ہے
جفا ہوتی رہی یہ بھی وفا ہے
بڑا احسان بے منّت جفا ہے
نہ فرمائیں سزا دینے کی زحمت
محبت آپ ہی اپنی سزا ہے
مجھے نادیدہ جلوے پر گماں تھا
یہ جلوہ تو مرا دیکھا ہوا ہے
حقیقت میں مرا گریہ ہی اے دوست
ترے لب پر تبسّم بن گیا ہے
ذہین اس بندگی سے باز آیا
وہ کافر کیا کوئی میرا خدا ہے



غم کا عرفان کہاں سے آئے
نت نئی جان کہاں سے آئے

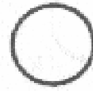
خیر سے، دھوم ہے مے خانے میں
ہم مسلمان کہاں سے آئے

چشمِ کافر، دلِ مومن میں بہم
عہد و پیمان کہاں سے آئے

حرم و دیر تہی دامن ہیں،
ہاتھ انسان کہاں سے آئے

حُسن ہر آن نئی شان میں ہے
جان پہچان کہاں سے آئے

پوچھتے ہو کہ ہے ارماں کوئی؟
دل میں ارمان کہاں سے آئے



جلوۂ ناتمام کا رنگِ تمام اور ہے
حُسن کی صبح اور ہے عشق کی شام اور ہے

غمزۂ خاص اور ہے جلوۂ عام اور ہے
دیکھ خرامِ حسن میں حُسنِ خرام اور ہے

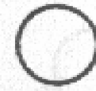
نام و نشان کی حدیں ختم ہوئیں تو یہ کھلا
آپ کے ہر نشان پر آپ کا نام اور ہے

گاہ صلائے بیخودی گاہ نوائے سرخوشی
عشق میں ہر مقام پہ میرا پیام اور ہے

رشتۂ ننگ و نام کاٹ دامِ دوئی تمام کاٹ
تیغِ خودی پہ ننگ و نام ایک نیام اور ہے

معرکۂ وجود میں تن ہے نیام من ہے تیغ
ضربتِ تیغ اور ہے ضربِ نیام اور ہے

مستئ گاہ گاہ سے کام نہیں ذہین کو
مستِ خدا کو لذتِ شربِ مدام اور ہے



اس دنیا کے اہلِ خرد بھی کب کم ہیں دیوانوں سے
یہ تشریحِ رازِ محبت ، کرتے ہیں افسانوں سے

شمع کی فطرت میں پوشیدہ شعلہ کس نے دیکھا تھا
اپنی آگ میں آپ ہی جلنا ، سیکھا ہے پروانوں سے

عقل کی آنکھوں میں پیارا ہے عشق کی آنکھوں کا تارا ہے
حُسن کو یکساں نسبت ہے ہشیاروں سے دیوانوں سے

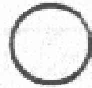
بھیس بدل کر وصل کے لمحے ، ہجر کی لمبی رات بنے
میرے شانوں تک آ پہنچیں زلفیں اُن کے شانوں سے

جو پیمانے ٹوٹ گئے وہ پیماں ۔ تھے جو ٹوٹ گئے
عہدِ وفا پھر باندھ رہے ہیں ہم ٹوٹے پیمانوں سے

کعبہ بن کر کعبے سے بھی کوئی نکلا ہو تو کہوں
نکلے وہ میخانہ ہو کر نکلے جو میخانوں سے

دشمنِ جاں ہے دشمنِ ایماں پھر بھی سچ تو یہ ہے ذھین
جانتے ہیں ہم اس کو پیارا جانوں سے ایمانوں سے

کراچی

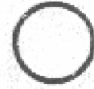


جس کو مرنا نہیں آتا وہی مر جاتا ہے
تم پہ مرتا ہے وہ مرنے سے گزر جاتا ہے

عشق جس راہ میں بےخوف و خطر جاتا ہے
عقل والا تو اسے دیکھ کے ڈر جاتا ہے

دل کی موجوں کے حوالے ہے سفینہ دل کا
دل کو خود بھی نہیں معلوم کدھر جاتا ہے

عالمِ عشق میں ہم نے تو یہ دیکھا ہے ذھین
کوئی کتنا ہی بگڑ جائے سنور جاتا ہے



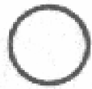
وہ شبِ غم بہت ہی یاد آئے
ہم کو خود ہم بہت ہی یاد آئے

دُور جا کر نگاہِ عالم سے
اور عالم بہت ہی یاد آئے

بیش از بیش بھولنا چاہا
وہ کم از کم بہت ہی یاد آئے

کیا کہیں ہم کو یاد کرتے ہیں
وہ جو ہر دم بہت ہی یاد آئے

اُس تبسم میں ڈوب کر بھی ذہین
دیدۂ غم بہت ہی یاد آئے



موت، جینے پہ جو رکھتی ہوئی الزام آئے
تم بھی آ جاؤ تو مشکل ہے کہ آرام آئے

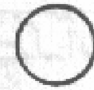
ہم تری انجمنِ ناز میں کچھ کام آئے
ہم پر آئے ترے جلووں پہ نہ الزام آئے

شرح کرتے ہوئے ہستی کی نئی مستی سے
تیری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے دو جام آئے

اِدھر آئے وہ اُدھر گردشِ ایام گئی
وہ اُدھر جائیں اِدھر گردشِ ایام آئے

دل میں، آنکھوں میں، تری بزم کو رکھ لائے ہم
وہ بھی ہوں گے جو تری بزم سے ناکام آئے

حسنِ برہم سے ہے آشفتگیِ عشق ذہین
زلف بکھرائے وہ آئے جو سرِ شام آئے



تمنا بت پرستی بت گری ہے — محبت ہر تمنا سے بری ہے

ترے حسنِ تمنا آفریں نے — خلوصِ عشق پر تہمت دھری ہے

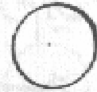
مرے قصد و طلب کا نام لیکر — روا اُن کے لئے جلوہ گری ہے

محبت ہر طرف ہے کارفرما — نہ بندہ نہ بندہ پروری ہے

نہیں مطلوب دیدہ ور تجلّی — تجلّی طالبِ دیدہ وری ہے

حضورِ عشق سے ہیں دور کوسوں — یہ کیا فکر و نظر کی خود سری ہے

ذھین اشعار کیا اسرارِ حق ہیں
ہماری شاعری پیغمبری ہے



حجابات میں آپ کی بے حجابی
نہ آئے نظر، تو نظر کی خرابی

ہوئی خلوتِ حُسن میں باریابی
زہے دیدۂ و دل کی عصمت مآبی

یہ حسن و محبت کی سرشاریاں ہیں
نہ وہ ہیں شرابی، نہ میں ہوں شرابی

وہ دِل جس میں تم ہو، تمہاری طرح ہے
نہ ناری، نہ خاکی، نہ بادی، نہ آبی

یہ شیشہ، یہ ساغر، یہ دل اور آنکھیں
ترے روئے گلگوں سے ہر شے گلابی

وہ حُسن کم آمیز، اَلحمدُ لِلّٰہ!
محبت سے سیکھا ہے کم اجتنابی

میرے دل کی بے تابیوں کا سبب ہے
پسِ پردۂ دل تیری برق تابی

سب انساں آدم سے آدم ہیں کس سے
ترابی نہیں جو نہیں بُو ترابی

ترے مُصحفِ رُخ کو قرآن جانیں
بس اتنا ہی کافی ہے علمِ کتابی

حصولی ہے ہر علم لیکن حضوری
بجُز عشق ہر اک فنِ اکتسابی

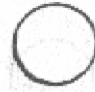
یہ کھانے کو غم اور پینے کو آنسو
محبت میں ہے رزق غیر اِحتسابی

خدایانِ آفاق، اصنامِ نَو ہیں
کہے لَا اِلٰہ، وہی انقلابی

خُدا آگہی کیا ہے خود آگہی میں
یہ ہے نیم بیداری و نیم خوابی

ملی ہے جو دُنیا کو، تعمیرِ نَو سے
نظر کی خرابی ہے، دل کی خرابی

دہکتے ہیں شُعلے، دمکتے گلوں میں
شجر کو ملی فطرتِ التہابی



کاروانِ عمرِ رفتہ کی نشانی رہ گئی
رُوح بن کر اضطرابِ جاودانی رہ گئی

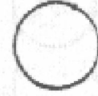
ایک نقطہ پر سمٹ کر زندگانی رہ گئی
نقش ہو کر دل میں ان کی مہربانی رہ گئی

ہم بہت آگے نکل آئے حیاتِ عشق میں
ساتھ تھوڑی دور چل کر عمرِ فانی رہ گئی

اپنی صورت دیکھ کر تیری حقیقت دیکھ لیں
اب یہی اک شکل ادراکِ معانی رہ گئی

آپ آجائیں تو ہو جائے یہ قصّہ بھی تمام
زندگی ہو کر ادھوری سی کہانی رہ گئی

اب تصوّر کی نظر سے دیکھ لیتا ہوں ذہین
اس جواں سج پور کو جس میں جوانی رہ گئی



نہ سمجھے گلرخوں کے ہم اشارے
ہمیں پتھر نہ مارے پھول مارے

نہ دیکھے اپنی کشتی نے تو کیا ہے
سُنا تو ہے کہ ہوتے ہیں کنارے

خلاصہ عمر بھر کی عاشقی کا
ہمارے تم نہیں ہم ہیں تمہارے

محبت دوستی ہے دشمنوں سے
ہوئے دل کے دشمن دل کے پیارے

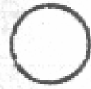
تمہیں تم ہو نہیں کچھ بھی کہیں اور
کہاں تشبیہ؟ کیسے استعارے

سنور جائیگا خود ہی نظمِ عالم
کوئی پہلے ترے گیسو سنوارے

دلِ پرسوز و آہِ آتشیں سے
نہیں آنسو نہیں ہیں جو شرارے

محبت فاتحِ عالم ہے لیکن
محبت میں وہی جیتے جو ہارے

ذھین آہستہ کوئے دوست میں چل
کہ آسودہ یہاں ہیں چاند تارے



میکدہ کا نظام بدلا ہے
نہ بدلنے سے کام بدلا ہے

چشمِ ساقی بجائے ساغر ہے
جام سے ہم نے جام بدلا ہے

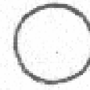
حُسن و اُلفت کبھی نہیں بدلے
ہر زمانہ میں نام بدلا ہے

نغمۂ عشق ہے نوائے ازل
صرف طرزِ کلام بدلا ہے

پاک ہے عشق ہر تغیّر سے
حُسن ہر صبح و شام بدلا ہے

ایک تیری نگاہ کیا بدلی
نظمِ عالم تمام بدلا ہے

مےکدہ ذوقِ فنا نے دیکھ ذھین
زندگی کا مقام بدلا ہے



عشق پر ہی مدارِ عالم ہے   عشق پروردگارِ عالم ہے

کچھ نہیں اعتبارِ عالم کا   عشق ہی اعتبارِ عالم ہے

عقل پردہ ہے روئے عالم پر   عشق آئینہ دارِ عالم ہے

ہائے بے اختیاریِ عالم   جبر ہی اختیارِ عالم ہے

جلوہ گاہِ حقیقتِ عالم   صورتِ آشکارِ عالم ہے

پاک نقش و نگارِ عالم سے   عشق نقش و نگارِ عالم ہے

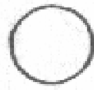
دورِ لیل و نہارِ عالم سے   عشق لیل و نہارِ عالم ہے

بے تعلق بہارِ عالم سے   عشق تنہا بہارِ عالم ہے

خار و گل سے بلند ہو کر عشق   گل عالم ہے خارِ عالم ہے

عالمِ جبر و جبرِ عالم عشق   عالمِ اختیارِ عالم ہے

وحدتِ عشق و عشق وحدت سے
کثرتِ بے شمارِ عالم ہے



چمن میں پتہ پتہ ہے وضو سے
ثنا خواں ہے زبانِ رنگ و بو سے

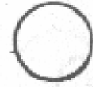
ہوئی رنگیں، قبائے لالہ و گل
شہیدانِ محبت کے لہو سے

شرابِ حسن، آنکھیں پی رہی ہیں
گلوں کے جام کلیوں کی سبو سے

ہنسی پھولوں کی، نغمے بلبلوں کے
چمن زندہ ہے ذوقِ آرزو سے

محبت میں طلب لازم ہے ورنہ
وہ گم ہوتے تو ملتے جستجو سے

ذہین، ادراکِ حسنِ بے جہت میں
نکل جاؤ جہانِ چار سو سے



عمر کیوں کشمکشِ سود و زیاں میں گذرے
جو گذرتی ہے نہ کیوں عشقِ بتاں میں گذرے

طلبِ حق ہے تو ہم وگماں سے گذریں
وہ حقیقت نہیں جو وہم و گماں میں گذرے

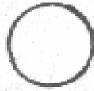
عمرِ دو روزہ بہر حال گذر جاتی ہے
وہ خوشی میں نہ سہی آہ و فغاں میں گذرے

دلِ یزداں میں ہے پوشیدہ تمنا کی طرح
وہ مناظر کہ نگاہوں سے جہاں میں گذرے

دلِ برباد میں آباد ہے کوئی جیسے
موسمِ گل کا گماں فصلِ خزاں میں گذرے

چند لمحے جو ترے ساتھ گذارے ہم نے
نہ زماں میں کبھی گذرے نہ مکاں میں گذرے

ہم نے جو سانس محبت میں لئے ہیں وہ ذھین
سایۂ نکہتِ گلزارِ جناں میں گذرے



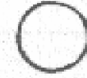
وہ دُور دُور نہیں ہے جو پاس آیا ہے
مرا خیال، بدل کر لباس آیا ہے

وہ آرہے ہیں جہاں یہ خبر ملی ہے وہاں
پیامِ رخصتِ ہوش و حواس آیا ہے

وہ التفات کسی کا مجھے تو راس آیا
کوئی بتائے کسی کو بھی راس آیا ہے

وہاں امید کے تحفے عطا ہوئے دل کو
جہاں نگاہ کو پیغامِ یاس آیا ہے

صنم پرست جب آیا صنم کدے میں ذھین
ہر ایک بت نے کہا: حق شناس آیا ہے



آج پھر طاعتِ بے کیف سے جی اکتایا
عہدِ مستی میں گذارے ہوئے دن یاد آئے

چشمِ ساقی جو تصور کی نظر سے گذری
مے پرستی میں گذارے ہوئے دن یاد آئے

غمِ ہستی سے نکل کر بھی شب و روز مجھے
غمِ ہستی میں گذارے ہوئے دن یاد آئے

صبحِ فردوس کی پرکیف بہاروں میں ذہین
ان کی بستی میں گذارے ہوئے دن یاد آئے

۱۹۴۷ء

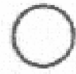
سے

۱۹۲۵ء

تک

متاعِ آرزومندی ازل سے تا ابد کیا ہے؟

تمنائے محال اول تمنائے محال آخر



دل سے ترا خیال بھلایا نہ جا سکا
میں مٹ گیا یہ نقش مٹایا نہ جا سکا

میں اپنے دل سے پوچھ رہا ہوں یہ بار بار
وہ آپ ہی نہ آئے کہ آیا نہ جا سکا

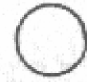
چہرے سے میرے کھل ہی گیا دل کا اضطراب
دامن سے یہ چراغ چھپایا نہ جا سکا

دل میں ہے اس ادا سے کہ دل کو خبر نہیں
وہ حسن جو کہیں بھی سمایا نہ جا سکا

تھا ایک لفظ وہ بھی مری داستان میں
جو عمر بھر زبان پہ لایا نہ جا سکا

آخر اُٹھا دیا وہ ہماری نگاہ نے
تم سے بھی جو حجاب اٹھایا نہ جا سکا

لازم طلب ہے میرے لئے ورنہ آکے ڈھیں
وہ گم ہی کب ہوا تھا جو پایا نہ جا سکا



تو نے دیوانہ بنایا تو میں دیوانہ بنا
اب مجھے ہوش کی دنیا میں تماشا نہ بنا

عشق میں دیدہ و دل شیشہ و پیمانہ بنا
جھوم کر بیٹھ گئے ہم وہیں میخانہ بنا

یہ تمنا ہے کہ آزادِ تمنا ہی رہوں
دلِ مایوس کو مانوسِ تمنا نہ بنا

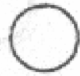
دلِ بیتاب کو تسکین تبسم سے نہ دے
چشمِ مجنوں کے لیے محملِ لیلیٰ نہ بنا

ذوقِ بربادیٔ دل کو بھی نہ کر تو برباد
دل کی اُجڑی ہوئی بگڑی ہوئی دُنیا نہ بنا

منکرِ ہوش ہوں میں معتقدِ ہوش نہ کر
مستِ امروز کو محوِ غمِ فردا نہ بنا

یوسفِ مصرِ تمنا ترے جلووں کے نثار
میری بیداریوں کو خوابِ زلیخا نہ بنا

نگہِ ناز سے پوچھیں گے کسی دن یہ ذہین
تو نے کیا کیا نہ بنایا کوئی کیا کیا نہ بنا



وہ رازِ حسن جسے حُسن بھی چھپا نہ سکا
ہمیں تھے اور کسی کو یقین آ نہ سکا

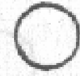
جہاں جو شے تھی وہیں رہ گئی، وہ جب آئے
حجاب جا نہ سکا ہوشِ دید آ نہ سکا

یہ زخم تازہ دیا اور میرے قاتل نے
کہ میرا حال جو دیکھا تو مُسکرا نہ سکا

بنا دیا تری نیچی نظر نے افسانہ
وہ ایک حرفِ محبت جواب پہ آ نہ سکا

مگر ہے خام ابھی ذوقِ خود فراموشی
جو دو جہان کو بھولا تمہیں بھلا نہ سکا

ذہین اُس رُخِ رنگین سے اٹھ گئی جو نقاب
حجابِ عشق رُخِ دل سے میں اُٹھا نہ سکا



ان کو قید کر بیٹھا اب اسیرِ دام اُن کا
تم مجھے جہاں پاؤ ہے وہی مقام اُن کا

تھا کبھی سکونِ دل اب تو آفتِ دل ہے
ہے دلِ شکستہ پر ضربِ درد نام اُن کا

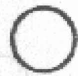
التفات مجھ پر ہی چاہیئے کہ دُنیا پر
جورِ خاص ہے ہمدم: مجھ کو لُطفِ عام اُن کا

بیخودِ محبت کو قصد کیا، طلب کیسی
جو تری طلب میں ہیں وائے ذوقِ خام اُن کا

دل پہ چھا رہے ہیں وہ یا تمام دُنیا پر
ہر نظر نظر اُن کی ہر سخن پیام اُن کا

موت سے کہاں کم ہے اے ذہین یہ منظر
آخری سلام اپنا اوّلیں پیام اُن کا

نادوتی۔ جون ۱۹۳۸ء



تم جس درد کے درماں ہو اس درد کی قسمت کیا کہنا
تم تقدیرِ محبت ہو، تقدیرِ محبت کیا کہنا

عشق کی صورت میں مُضمر ہے حُسنِ حقیقت کیا کہنا
میں گویا تیری محفل ہوں تو میری خلوت کیا کہنا

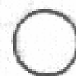
دیوانۂ حُسن کبھی تھا میں، اب حُسن ہے میرا دیوانہ
اے جذبِ عشق، تعالی اللہ، تاثیرِ محبت کیا کہنا

آ مجھ سے مجھ کو لے بھی لے، باخود ہوں تو بیخود کر دے
میں تیری مستی کے صدقے ہستی کی حسرت کیا کہنا

ان میٹھی میٹھی نظروں سے، اُن پیاری پیاری باتوں سے
بیدرد نے درد بھی چھین لیا اب دل کی حالت کیا کہنا

وہ تیرا ذہین وہ دیوانہ وہ رندِ خرابِ میخانہ
ہر راز ہے اس کا افسانہ اب اس کی حالت کیا کہنا

نادوتی۔ مارچ ۱۹۳۸ء



دیکھ کر بھی روئے جاناں، سب سے ان دیکھا رہا
فرق پھر غیب و شہادت میں رہا تو کیا رہا

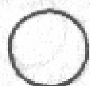
خلوت آرائی نہ چھوڑی ، انجمن آرا رہا
وہ نظر سے دُور ہو کر بھی نظر آتا رہا

کچھ بتائیں تو بتائیں نَو بہ نَو جلوے ترے
میرے رُخ پہ رنگ کیوں آتا رہا جاتا رہا

بن گئی معیار اچھائی کا اچھوں کی پسند
جس کو تم نے کہہ دیا اچھا ، وہی اچھا رہا

چشمِ خفتہ کا مقدر دولتِ بیدارِ حُسن
خواب میں یوسف زلیخا کو نظر آتا رہا

حُسن ، بے پردہ نظر آنے کا خوگر ہے ذہین
درمیاں لیکن، حجابِ دیدۂ بینا رہا



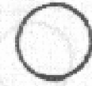
تمہی تم ہو بہار ماسوا کیا
نہو جب تم نظر میں دیکھنا کیا

جفا بھی التفاتِ ناز میں ہے
نیازِ عشق کو نازِ وفا کیا

دلیلِ ہستئ طالب ہے مطلب
نہیں جب مدعی تو مدعا کیا

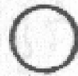
تری پہلی نظر سے کوئی پوچھے
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

ذہین ان پر فدا بھی ہے خفا بھی
خدا معلوم یہ دل کو ہُوا کیا

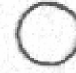


دیکھنے والوں نے دیکھا ہی نہ تھا ورنہ قطرہ عینِ دریا ہی نہ تھا
دیکھئے نیرنگِ اندازِ نظر ہم نے دیکھا تھا کہ دیکھا ہی نہ تھا
لائیے وہ دن کہاں سے ڈھونڈ کر دل میں جب دردِ تمنا ہی نہ تھا
میری اُلفت وجہِ آفت ہو گئی ورنہ وہ مجھ سے شناسا ہی نہ تھا
یاد ہے کیا تھی حقیقت حُسن کی جب مجھے ذوقِ تماشا ہی نہ تھا
اتنی بیگانہ وشی اچھی نہیں دیکھنے والوں کو دیکھا ہی نہ تھا
کیوں رہا احساسِ بے ہوشی کلیم جب تمھیں ہوشِ تماشا ہی نہ تھا

میری خلوت اُن کی محفل تھی ذھین
میں کسی عالم میں تنہا ہی نہ تھا



نصیبِ گریۂ بے اختیار ہونا تھا
وہ درد، دل میں جو تھا بار بار ہونا تھا
خزاں کو یوں نہ شہیدِ بہار ہونا تھا
ابھی کسی سے مجھے ہمکنار ہونا تھا
بجا کہ تھا یہی منشائے چشمِ یار، مگر
جگر کو بھی ہدفِ تیرِ یار ہونا تھا
ہزار چارۂ سودائے غم کیا، لیکن
وہی ہوا کہ جو انجامِ کار ہونا تھا
ترا نقاب اٹھانا کسی کا ہٹ جانا
یہ ایک راز تھا جو آشکار ہونا تھا
اس انجمن میں جہاں آپ مسکراتے تھے
ہنسی کی بات مرا اشکبار ہونا تھا
ذھین میں نے تو ہر چند اجتناب کیا
مگر نصیب میں ہی بادہ خوار ہونا تھا



بُتِ کافر ادا نے مجھ کو دیکھا
خدا جانے خدا نے مجھ کو دیکھا

نگاہوں کی دُعا نے مجھ کو دیکھا
نظر نا آشنا نے مجھ کو دیکھا

وہاں حائل حجابِ عشق نکلا
جہاں تیری حیا نے مجھ کو دیکھا

خدا کے دیکھنے والے ہیں شاہد
خودی کی انتہا نے مجھ کو دیکھا

خدا کو میں نے دیکھا یا نہ دیکھا
یہ دیکھا کہ خدا نے مجھ کو دیکھا

میں خود اپنی نگاہوں پر فدا ہوں
یہ دیکھا دل رُبا نے مجھ کو دیکھا

محبت پر اب اترائے محبت
محبت آزما نے مجھ کو دیکھا

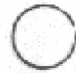
سراپا وہ نظر تھے چشمِ بد دور
کسی کی ہر ادا نے مجھ کو دیکھا

نظر کی انتہا نے تجھ کو ڈھونڈا
نظر کی ابتدا نے مجھ کو دیکھا

نہ پایا آئینہ کوئی جب اپنا
نگاہِ خود نما نے مجھ کو دیکھا

ہوئے آباد دشت و در کے مندر
جنوں کے دیوتا نے مجھ کو دیکھا

محبت میں ذہینؔ اس دل کے ہاتھوں
دکھایا جو خدا نے مجھ کو دیکھا



زمانہ دشمنِ دیں رہزنِ ایماں نظر آیا
یہاں ہر جلوہ ہم کو جلوۂ جاناں نظر آیا

وہ آئے وہ شکستِ زہد کا ساماں نظر آیا
غمِ طاعت پہ ذوقِ معصیت نازاں نظر آیا

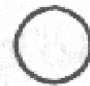
وہی حدِّ نظر سے دور بھی ہے جو نظر میں ہے
عیاں جو کچھ نظر آیا وہی پنہاں نظر آیا

شبِ غم پھر ہوا برہم نظامِ لذّتِ زاری
وہ ظالم پھر تصور میں مجھے خنداں نظر آیا

محبت حسن بن کر چھا گئی ایک ایک ذرّہ پر
ترا جلوہ بہر صورت بہر عنواں نظر آیا

دمِ سرد اور آہِ گرم سے کیا کیا بچایا ہے
تری محفل میں دل شمعِ تہِ داماں نظر آیا

ملے وہ، کھو گئے ہم اے ذہینؔ اللہ رے قسمت
کسی کا وصل بھی ہم معنیٔ ہجراں نظر آیا



خود اٹھ گیا جو راہِ طلب کا حجاب تھا ۔ ذرہ مری نظر میں نہ تھا آفتاب تھا

دیکھا نہ اے کلیم یہ کیا اضطراب تھا ۔ جلوہ سمجھ رہے تھے جسے تم حجاب تھا

اٹھا ترا نقاب نہ میرے لٹے بغیر ۔ میں کوئی بزمِ غیر میں تیرا حجاب تھا

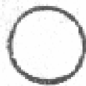
ہم بیخودِ نگاہ اگر دیکھتے تو کیا ۔ یعنی حجاب جلوہ تھا جلوہ حجاب تھا

تو بعدِ جلوہ چھپ گیا اور کوئی مٹ گیا ۔ وہ بھی تری ادائے حیا کا جواب تھا

کہتے ہیں وہ مری صفِ ماتم میں بیٹھ کر ۔ کچھ بھی نہ تھا تو ذوقِ ستم کامیاب تھا

تجھ کو سلام اے نگہِ التفاتِ دوست! ۔ میں بدنصیب تابہ نگاہِ عتاب تھا

دیکھا گیا ذہین جو دیکھا نہ جا سکا
ناکام بھی نگاہ تو دل کامیاب تھا



غفلت نہ تھی تصورِ دیدارِ یار تھا ۔ نظارۂ جمال میں گم انتظار تھا

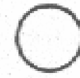
ہوں عالمِ سکوں میں کہ عالم سکوں میں ہے ۔ میں بیقرار تھا کہ جہاں بیقرار تھا

تھی صورتِ حجاب حقیقت نگاہ کی ۔ جو راز آشکار نہ تھا آشکار تھا

ساقی تری شراب میں، یہ خاص بات تھی ۔ نشہ بقدرِ حوصلۂ بادہ خوار تھا

کوئی گناہ، ہوش سے بڑھ کر نہیں گناہ ۔ جو مست ہو گیا، وہ بڑا ہوشیار تھا

میں ہو گیا غبارِ رہِ دوست اے ذہین
پھر بھی کسی کی خاطرِ نازک پہ بار تھا



حقیقت ہے کہ امرِ اتفاقی بار بار دیکھا
جہاں وہ بُت نظر آیا وہیں ہم نے خدا دیکھا

طلب کی کامیابی نے نظر کی بے حجابی نے
وہی پایا ہوا پایا وہی دیکھا ہوا دیکھا

نہیں معلوم یہ بیتابیٔ دل چاہتی کیا ہے
جہاں تک بھی نگاہِ شوق سے دیکھا گیا دیکھا

نگاہِ شوق کی یہ خوش نصیبی تو کوئی دیکھے
کسی کا دیکھنا ہی کیا کسی کا دیکھنا دیکھا

سراپا حُسن ہے حُسنِ سراپا ہے وہ کیا کہنا
بحسبِ کامِ دل دیکھا، بحسبِ مدعا دیکھا

ذہینِ یوسفی کو فخرِ پابوسی بھی حاصل ہے
کہ اس کی خاکِ مرقد پر تمہارا نقشِ پا دیکھا



سوزِ دل سے نہوا یہ کہ اُجالا نہ ہوا
کون سا داغ حریفِ یدِ بیضا نہ ہوا

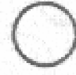
ہدفِ تیرِ نظر، بسملِ تیغِ ابرو
کیا نہ ہوگا تری الفت میں کوئی کیا نہ ہوا

میں تو مجبور تھا افشائے غمِ الفت پر
آپ سے بھی نہوا یہ کہ میں رسوا نہ ہوا

حُسنِ خود بیں کو ہے آئینہ میں کیا کیا حیرت
عکس سمجھا ہے جسے دیکھنے والا نہ ہوا

جنبشِ پردہ ہے آوازِ خرامِ جلوہ
یہ تو غمازِ تجلّی ہوا پردا نہ ہوا

لوگ جو چاہیں سمجھتے رہیں اب مجھ کو ذہین
میں حقیقت میں ہوں وہ راز کہ افشا نہ ہوا



کیوں دامنِ قاتل پر اب تک ہے کرم میرا
کیوں منزلِ ہستی میں اب تک ہے عدام میرا

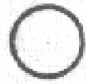
دل آج تڑپتا ہے اُس فرصتِ زاری کو
خلوت میں نہ تھا، ہمدم جز نالۂ غم، میرا

یوں جوشِ طلب پر ہیں آدابِ طلب غالب
آگے نہیں بڑھتا ہے رہبر سے قدم میرا

کچھ ہو تو چلے پیدا آثار بھی جینے کے
ہاں ساتھ دیئے جانا اے کاہشِ غم ! میرا

انجامِ محبت بھی حسرت کا مُرقع ہے
تم ہو مری آنکھوں میں، آنکھوں میں ہے دم میرا

ساقی کی نظر میں تھی کیا بات ذہین آخر
دل جھک گیا خود میرا سر ہو گیا خم میرا



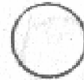
عالمِ تن میں جہانِ رازِ جاں پیدا کیا
میں نے خود اپنا زمین و آسماں پیدا کیا

کیا کلیسا، کیا حرم، کیا دیر، چشمِ شوق نے
حُسنِ پنہاں کو جہاں چاہا وہاں پیدا کیا

آ رہے ہیں وہ تصور میں کہیں جاتے ہوئے
حُسنِ ظن سے میں نے حسنِ بدگماں پیدا کیا

ذوقِ بربادی کے سائے میں چمن آباد ہے
آشیاں نے فکرِ برقِ آشیاں پیدا کیا

عشق ہے پروردگارِ کیف و مستی اے ذہین
عقل نے کیا جز غمِ سود و زیاں پیدا کیا



اگر ہے جستجو آزادِ قیدِ جستجو ہو جا
سمجھ لے دیکھ لے دل میں جہاں میں تو ہی تو ہو جا

نہ آسادہ دلی شوق دامِ حُسن میں ہر گز
کسی کی آرزو کیا آپ اپنی آرزو ہو جا

زبانِ عشق میں کیا کام الفاظ و عبارت کا
سراپا عشق بن جا تو سراپا گفتگو ہو جا

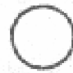
ہوس کو آرزو ہائے نمود و نام لازم ہیں
محبت ہے تو اے بے آبروئی آبرو ہو جا

نہ لے ساغر نہ کر توہینِ چشمِ مستِ ساقی کی
ملا ساقی سے آنکھیں دشمنِ جام و سبو ہو جا

کسی کے درد و غم میں کیف و لذت کی ضرورت کیا
کہیں تو حُسنِ جاناں بے نیازِ رنگ و بو ہو جا

وہ کب سے منتظر ہیں کچھ حجابِ عشق کی حد بھی
الٹ دے اے ذھین اپنا نقاب آ رو برو ہو جا

۲۲ جولائی ۱۹۳۵ء



تم نہیں نظر میں جب لطفِ مے پرستی کیا
تم نگاہ میں جب ہو احتیاجِ مستی کیا

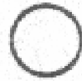
میرے جلوے ہی مجھ کو قابلِ پرستش ہیں
ذوق خود پرستی ہے پھر خدا پرستی کیا

وصل زندگی ٹھیرا۔ وجہِ زندگی معلوم
اعتبار ہے ہستی، اعتبارِ ہستی کیا

اصل میں بلندی بھی کیا ہے، اک تعین ہے
جب نہیں بلندی تو امتیازِ پستی کیا

جس میں دل کی ویرانی اے ذھین بستی ہو
آسمان کے نیچے ہے کہیں وہ بستی کیا

جے پور۔ ۱۱ اگست ۱۹۳۱ء



فروغِ حُسن کیا آئینہ سیما ہو نہیں سکتا؛

وہ پردہ جو ترے رُخ پر ہے، پردا ہو نہیں سکتا
اگر ہم ہیں تو رازِ عشق رُسوا ہو نہیں سکتا

وہ دل میں دردِ پنہاں ہے کہ پیدا ہو نہیں سکتا
گراتے بجلیاں، لیکن وہ اتنا دیکھ تو لیتے

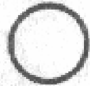
کہ یکساں میرا دل اور طورِ سینا ہو نہیں سکتا
تمہیں کہہ دو کہ تم سا اور بے صبر آزما کوئی

یہ مانا کوئی مجھ سا ناشکیبا ہو نہیں سکتا
خبر بھی ہے تمہیں کچھ بے زبانی ہائے الفت کی

سُنو بھی تم، تو اظہارِ تمنا ہو نہیں سکتا
کبھی خلوت ہے محفل میں کبھی محفل ہے خلوت میں

کسی عالم میں بھی ہو حُسن تنہا ہو نہیں سکتا
ذھین اپنے ہی آئینے کی خوبی حُسنِ محبوبی

ہم اچھے ہیں تو کوئی اُن سے اچھا ہو نہیں سکتا



وہ بن کر مہرِ عالم تاب آئے بھی تو کیا ہوگا
یہ دل شمعِ سحر تھا شامِ غم سو جل بُجھا ہوگا

نہ دیکھا حُسن خود بیں رفتہ رفتہ خود نما ہوگا
یہ آئینہ تجھے کس کی نظر سے دیکھتا ہوگا

وہ جلوہ جو نگاہِ غیر تک بن کر حجاب آیا
ابھی عینِ نظر ہو کر نظر نا آشنا ہوگا

یہ کیف و حال میں ڈوبا ہوا میخانہ کیا جانے
جہانِ کفر و دیں میں کیا ہوا ہے اور کیا ہوگا

میں اپنے عشق کے صدقے تمہارے حُسن کے قرباں
نہ مجھ سا دوسرا ہوگا نہ تم سا دوسرا ہوگا

محبت کا محبت ہی نہیں حاصل تو پھر ہم سے
حصولِ مدعا ہوگا نہ ترکِ مدعا ہوگا

نمازِ بے حضور اچھی نہ سجدہ بے یقیں اچھا
ہمیں معلوم ہے یہ بُت جہاں ہونگے خدا ہوگا

گیا گزرا ذھین اب تو جہاں وہ تھا وہاں تو ہے
جہاں تو ہے وہاں اے دوست! کیا تیرے سوا ہوگا



پھر ترے وعدے پہ ظالم اعتبار آہی گیا
بیقراری میں بھی یک گونہ قرار آہی گیا

اللہ اللہ یہ تصور یہ تصور کا فریب
جیسے پہلو میں وہ جانِ انتظار آہی گیا

کس قدر دل تھا خفا غارت گرِ دل سے مگر
اس ادا سے سامنے آیا کہ پیار آہی گیا

عشق پابندِ ادب ہے حسن مانوسِ حجاب
وصل آکر بھی نہ آیا انتظار آہی گیا

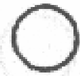
داد ہے زاہد! ترے طرزِ بیانِ زہد کی
جیسے مے خانے میں جاکر ہوشیار آہی گیا

جبر اپنے دل پہ ہم نے جو نہ کرنا تھا کیا
آگیا تو یاد اور بے اختیار آہی گیا

بن گئی افسانۂ رنگیں مری رودادِ غم
ہاں خزاں کے ذکر میں رنگِ بہار آہی گیا

وہ کبھی آتے نہ آتے میرے مرقد پر ذہین
اتفاقاً راہ میں میرا مزار آہی گیا

کھنڈیلہ (ریاست جے پور) ۲۷ر جولائی ۱۹۳۵ء شنبہ



پاس آکر دیکھنا ہے دور جاکر دیکھنا
تیرا پردہ ہے تجھے پردہ اٹھاکر دیکھنا

ہے مقامِ عشق پر دھوکا حریمِ حُسن کا
میں کہاں ہوں آپ میرے پاس آکر دیکھنا

دیکھتا کیا ہوں کہ یہ محفل کی محفل ہو تمہیں
تم کبھی خلوت میں یہ محفل سجاکر دیکھنا

دیکھنے کی چیز ہے اندازِ بیگانہ وشی
مجھ میں رہ کر دیکھنا مجھ میں سماکر دیکھنا

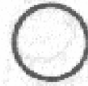
آج دل بے کیف سا ہر منظرِ رنگیں میں ہے
تم محبت کی نظر سے مسکراکر دیکھنا

عشق کا حق ذوقِ خود بینی کو آخر کیوں ملے
آپ اپنے حسن کے جلوے دکھاکر دیکھنا

پوچھتے کیا ہو کہ کیا ہے میرے دل میں کیا کہوں
ہو اگر ممکن تو آئینہ اٹھاکر دیکھنا

اس نظر کے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے ذہین
غیر بن کر دیکھنا اپنا بناکر دیکھنا

BZSTRFT



پھولوں کا کھل کھلانا کلیوں کا مسکرانا
سارے چمن کا مقصد ہنس کر مجھے ہنسانا

دُوری کی لذتوں سے محرُوم کیوں رہے دِل
تم مجھ سے دُور جا کر پھر میرے پاس آنا

وہ مجھ سے دُور جا کر پھر پاس آ گئے ہیں
پھر آ گیا ہے دیکھو گزرا ہوا زمانا

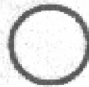
آؤ کہ ایک لمحہ ہم تم بھی ساتھ بیٹھیں
دم لینے رک گیا ہے چلتا ہوا زمانا

دل کا تمہارے غم میں جلنا ہی مصلحت ہے
شعلوں سے کھیلنا تو دامن کو کیا بچانا

کیسی حسین غم کی تصویر کھینچ رہی تھی
وہ رات آنسوؤں میں تاروں کا ڈوب جانا

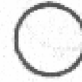
دل مجھ سے کہہ رہا ہے یوں اُن کے دل کی باتیں
جیسے وہ کہہ رہے ہوں مجھ سے مرا فسانا

وہ اے ذہین دل سے جائیں گے کیا نکل کر
آتا نہیں ہے جن کو دامن چھڑا کے جانا

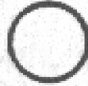


عشق پر زور چل نہیں سکتا — دل نہ سنبھلے سنبھل نہیں سکتا
یہ محبت ہے وہ مقام جہاں — عقل سے کام چل نہیں سکتا
آئیں گے وہ ضرور آئیں گے — موت کا وقت ٹل نہیں سکتا
دے رہے ہیں تسلیاں وہ بھی — دل بہلنے کو بہل نہیں سکتا
قیدِ ہستی سے میں نکل کر بھی — ان کے دل سے نکل نہیں سکتا

عشق تھا اے ذہین قسمت میں
کوئی قسمت بدل نہیں سکتا

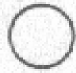


کوئی غم کچھ ملال ہی نہ رہا جب وہ پرسانِ حال ہی نہ رہا
محو تیرے خیال میں ہو کر کوئی مجھ کو خیال ہی نہ رہا
کیا کبھی یہ خیال بھی آیا تم کو میرا خیال ہی نہ رہا
ہر تمنا جواب دے بیٹھی لب پہ کوئی سوال ہی نہ رہا
جب سے ممکن ہوا ترا ملنا عشق میں کچھ محال ہی نہ رہا
اور پھر کیا رہے گا دنیا میں دو گھڑی ایک حال ہی نہ رہا
آگیا حُسن میں جلالِ عشق حُسن، صاحب جمال ہی نہ رہا
عشق جانِ جہاں، جہانِ جاں جان دینا کمال ہی نہ رہا
واقعہ ہے ذہین میرے لئے
وہ خیال اب خیال ہی نہ رہا



زندگی میں شباب دیکھ لیا خواب میں جیسے خواب دیکھ لیا
آئینے میں جواب دیکھ لیا کیوں مرا انتخاب دیکھ لیا
عشق نے کھول دیں مری آنکھیں حُسن کو بے حجاب دیکھ لیا
حسن مضطر ہے مطمئن ہے عشق ہم نے یہ انقلاب دیکھ لیا
روئے جاناں پہ تھی نگاہ نقاب خود اٹھا کر نقاب دیکھ لیا
فیضِ ساقی سے غرقِ جامِ ذہین
ماہتاب آفتاب دیکھ لیا

(جے پور۔ ۱۹۲۹ء)



اے جنونِ نگاہ کیا کہنا — حُسن کے دل کی آہ کیا کہنا

جو دو عالم کو مضطرب کر دے — مضطرب وہ نگاہ کیا کہنا

بندۂ بندۂ محبت ہیں — حُسن کے بادشاہ کیا کہنا

اے ستم کش یہ کیا ستم ڈھایا — لطف ہے عذر خواہ کیا کہنا

حسن ہے دل ہی دل نظر ہی نظر — عشق کی جلوہ گاہ کیا کہنا

حسن ہے ساتھ ساتھ راہ نورد — عشق ہے خضرِ راہ کیا کہنا

عشق ہے حُسن اور حُسن ہے عشق — غیریت ہے گناہ کیا کہنا

اب اللہ جنوں ہے ہر ذرہ — کفر ہے لا الٰہ کیا کہنا

حُسن عاشق ہے خود محبت پر — عشق کا عز و جاہ کیا کہنا

حُسنِ نظارہ سوز کو دیکھا — اے گناہِ نگاہ کیا کہنا

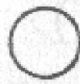
اپنی گم گشتگی ہی منزل ہے — راہ تھی سدِ راہ کیا کہنا

حُسن کو عشق کی حکومت سے — نہیں ملتی پناہ کیا کہنا

نہ خوشی ہے نہ کوئی غم ہے ذہین

آہ کیا کہنا واہ کیا کہنا

نادوتی مارچ ۱۹۳۸ء



یہ بیانِ حُسن ہی حُسن بیاں ہو جائے گا

تیرا افسانہ ہماری داستاں ہو جائیگا

سازِ دل پر تم نے چھیڑا تھا تبسم کا جو گیت

کیا خبر تھی ایک دن آہ و فغاں ہو جائیگا

مصرِ دل آباد تو ہو جائے پہلے عشق سے

حُسنِ یوسف کارواں در کارواں ہو جائیگا

بجلیوں کی گود میں ہے ذوقِ پروازِ حیات

آشیاں ہم سایۂ برقِ تپاں ہو جائیگا

حُسنِ صورت سے نظر حُسنِ حقیقت تک نہ جائے

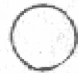
ورنہ زاہد بھی پرستارِ بتاں ہو جائیگا

پردہ ہائے رنگ و بو دل سے اگر اٹھتے رہے

ہر تصور آپ کا تصویرِ جاں ہو جائے گا

اے ذہین اپنی جبیں ہے کعبۂ رسمِ نیاز

دور اب فرقِ جبین و آستاں ہو جائیگا



تو شدتِ ظہور میں مستور ہوگیا
خود مانعِ نگاہ یہاں نور ہوگیا

میں جس قدر قریب ہُوا تو اُسی قدر
مجھ سے مسرتوں کی طرح دُور ہوگیا

وہ برہمی تری کہ تمنائے دید پر
میری نظر کو صاعقۂ طور ہوگیا

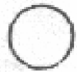
کرکے ستم بھی تو نے کرم کی نہ کی نظر
دل میں پڑا جو زخم وہ ناسُور ہوگیا

اس بے رُخی کا آہ ہوا مجھ پہ یہ اثر
انجامِ کار یاس پہ مجبور ہوگیا

اس یاس کے ہجوم میں احساس بھی نہیں
مغموم ہوگیا ہوں کہ مسرور ہوگیا

خود اپنی آرزو نہ ذھین ان کی آرزو
دونوں ہی آرزوؤں سے میں دُور ہوگیا

نادونی (ریاست جے پور ۱۹۳۹ء)



دل کے ہر ذرے میں ہے طوفان بحرِ نور کا
اپنے ہر جلوے میں جلوہ دیکھتا ہوں طور کا

ہجر ہے حفظِ مراتب، وصل ہے ترکِ ادب
چاہیئے موسیٰ کے پہلو میں جگر منصور کا

ہوگیا گم ذوقِ نظارہ نظر بھی کھوگئی
اللہ اللہ ایک ہونا ناظر و منظور کا

دل کے ذروں میں نظر کی کچھ شعاعیں ڈھونڈ کر
"آؤ پھر ترتیب دے ڈالیں فسانہ طور کا"

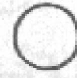
پھر خمارِ شوق میں لیتا ہے دل انگڑائیاں
پھر خیال آیا کسی کی نرگسِ مخمور کا

پھر چلا ہے بجلیوں سے کھیلنے کو طفلِ دل
ہو رہا ہے پھر تصور عارضِ پُر نور کا

پھر نگاہِ مست پیغامِ وداعِ ہوش ہے
پھر بعنوانِ تبسم ہے فسانہ طور کا

دیکھئے تو کچھ نہ ہونے پر بھی سب کچھ ہوں ذھین
نام خود مختار بھی ہے بندۂ مجبور کا

مشاعرہ ہنڈون، ریاست جے پور، ۳۰ جنوری ۱۹۳۹ء



مری مایوسیوں کا سلسلہ امید افزا تھا
وہ دن بھی یاد آتے ہیں کہ جب بے ذوقِ تمنا تھا

وہ کہہ دیتے کہ ہم دنیا میں تیرے ہو نہیں سکتے
میں دنیا سے گزر جاتا مرا دنیا میں پھر کیا تھا

مجھے ہنسنے میں بھی اب تو کوئی لذت نہیں ملتی
وہ کیا دن تھے کہ میں روتا تھا اور اک لطف آتا تھا

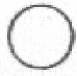
جو آئے بھی تو کیا الزام آئے میری آنکھوں پر
مذاقِ پردہ داری طالبِ ذوقِ تماشا تھا

وہ جلوہ جو کبھی پابندِ صورت ہو نہیں سکتا
تصور میں نہ آیا تو تخیل میں نہ آنا تھا

نشاطِ ہوش و کیفِ بے خودی دونوں برابر ہیں
مرا بے ہوش ہو جانا بھی تیری ایک دنیا تھا

نگاہِ سجدہ ریز آدابِ منزل بھول سکتی تھی
کسی کی رہگزر کا ذرہ ذرہ چشمِ بینا تھا

ذہین اک لفظِ ذو معنیٰ ہوں حیرت گاہِ ہستی میں
مرا ہونا نہ ہونا ہے نہ ہونا میرا ہونا تھا



قیامت خیز منظر حسن و الفت کا تصادم تھا
مری آنکھوں میں آنسو تھے ترے لب پر تبسم تھا

وہ رنگیں بجلیاں پھر پھوٹ نکلیں تیرے ہونٹوں سے
یہ دل پہلے ہی بحرِ نور میں غرقِ تلاطم تھا

مری خوں گشتہ امیدوں کا تھیں اک منظرِ رنگیں
وہی رنگینیاں جن کا ترے رخ پر تراکم تھا

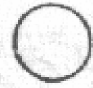
ترستا ہوں میں اب اس لذتِ شبہائے زاری کو
کہ جو نالہ تھا موزوں تھا جو گریہ تھا ترنم تھا

قیامت تھی کسی کی جستجو میں یہ فراموشی
وہاں پایا کسی کو ڈھونڈھنے والا جہاں گم تھا

ادھر تھا نزع کا عالم ترے بیمار پر طاری
ادھر تیری نگاہِ ناز میں ایمائے قم قم تھا

ذہین اور آپ اس کو بھول جائیں اس کے مرتے ہی
فراموشی کے قابل وہ سزاوارِ ترحم تھا

جے پور ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء



امتیازِ کفر و ایماں آج مشکل ہو گیا
ہر نظر تیری نظر ہر دل مرا دل ہو گیا

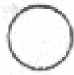
حُسن آخر حُسن ہے کیا بے حجابی کیا حجاب
دل کو جانا ہی تھا خلوت ہو کہ محفل ہو گیا

اللہ اللہ بازیِ طفلانۂ ذوقِ فنا
عشق جس گرداب سے کھیلا وہ ساحل ہو گیا

میں جہاں بھی ہوں حریمِ حسن میں ہوں گامزن
مرحبا اے عشق اب ہر گام منزل ہو گیا

میں ہی ہر ذرّے کے دل میں جلوہ گر ہوں اے ذہین
حُسن کی تکمیل ہی کیا عشق کامل ہو گیا

ہنڈون - جون ۱۹۳۹ء



نظر نواز تجلائے حسنِ جاناں تھا
مری نگاہ میں ہر ذرہ مہرِ تاباں تھا

کسے غرض کہ ہو آدابِ عشق سے واقف
میں مطمئن نظر آتا تھا اور پریشاں تھا

یہ خوش نصیبیٔ الفت نہیں تو پھر کیا ہے
وہی جفائیں بھی کرتا ہے جو پشیماں تھا

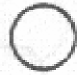
بہارِ حسن بسی ہے دل و نظر میں ذہین
مری نگاہ میں صحرا نہ تھا گلستاں تھا

گنگاپور - جون ۱۹۳۹ء



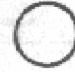
فروغِ جلوۂ جانانہ ہو جا
چراغِ کعبہ و بت خانہ ہو جا
رقیبِ شیشہ و پیمانہ ہو جا
دلِ مستانہ خود میخانہ ہو جا
جنونِ ہوش سے بیگانہ ہو جا
اگر ہشیار ہے دیوانہ ہو جا
مآلِ عشق کا افسانہ ہو جا
خرابِ جلوۂ جانانہ ہو جا
رخِ گل دیکھ بن مثلِ بلبل
پیامِ شمع سن پروانہ ہو جا
کس کی یاد کا ہے اب تقاضا
کہ تو بھولا ہوا افسانہ ہو جا
ذھین اس میں ہے سب ہونا نہ ہونا
فقط خاکِ درِ میخانہ ہو جا

سوائی مادھوپور، ۱؍مئی ۱۹۳۵ء



پردہ ہائے تعینات اٹھا — موت میں لذتِ حیات اٹھا
ان کی بے التفاتیوں سے بھی — لذتِ ذوقِ التفات اٹھا
دیکھ ہر شان میں ادا اس کی — آنکھ محوِ تجلیات اٹھا
دیکھ بے رنگیوں میں نیرنگی — رنگ و بو کے تعینات اٹھا
موجزن دیکھ دل میں بحرِ حسن — پردہ ہائے حریمِ ذات اٹھا
ہجر ہے ایک وصلِ نامحسوس — دل سے قیدِ توہمات اٹھا
اے ذھین اپنی بے نقابی سے
پردۂ روئے کائنات اٹھا

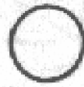
سوائی مادھوپور ۲؍جون ۱۹۳۵ء



عشق میں رنج کیا مسرت کیا — امتیازاتِ وصل و فرقت کیا
ہوسِ خام، آرزوئے دید — یہ ہوس ہے تو پھر محبت کیا
مجھ سے میری حکایتیں سُنئے — آپ سے آپ کی شکایت کیا
الاماں رعبِ حُسن کا عالم — وصل یہ ہے تو پھر ہے فرقت کیا
اپنی ہستی خود اعتباری ہے — اعتباراتِ رنج و راحت کیا

بے خودی میں بھی ہے ذہینِ خودی
ورنہ اپنی سے مجھے ضرورت کیا

وزیرآباد — ۱۹۳۴ء



نگاہیں منتظر ہیں کب سے اے جانِ تماشا آ
میری شبہائے مایوسی میں اے صبحِ تمنّا آ
جہانِ رنگ و بو ہو جائے خلوتِ حُسنِ رنگیں سے
بصد رنگینیٔ گل آ بصد مستیٔ صہبا آ
نیازِ عشق و نازِ حُسن دونوں تیری شانیں ہیں
برنگِ روئے مجنوں آ بموئے زلفِ لیلیٰ آ
خرامِ ناز سے پامال کر دے دونوں عالم کو
ہزاروں جلوہ ہائے ناز سے آ، اور تنہا آ
دلِ افسردہ رُوحِ ناشگفتہ کی دعائیں سُن!
توانِ ناتواں آ، شکیبِ ناشکیبا آ

ہزاروں سجدہ ہائے نا ادا کردہ پذیرا کر
ادا فہمِ محبت، فطرتِ دل کے شناسا آ

ہزاروں آرزو بیتاب ہیں قربان ہونے کو
تمنا آگہی کی شان سے جانِ تمنا آ

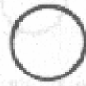
سخن ہائے نہفتہ میرے دل سے بے تلفظ سن
سراپا صورتِ اسرار بن کر حسنِ معنیٰ آ

دلِ بے رنگ پھر ہے منکرِ نیرنگِ نظارہ
شبِ تنزیہ کعبہ! صبحِ تشبیہِ کلیسا آ

بدل دے خاکدانِ دہر کے ہر ذرہ کا محمل
اسی دنیائے خاکی میں بسا دے دل کی دنیا آ

یہ آ حسنِ طلب ہے آہ مخفی ہے ذھین اس میں
مگر آہ کے پردے میں ہے لے پردہ در آ آ

۱۹۳۲ء



وفورِ عشق میں سود و زیاں کو بھول گیا
میں تیری یاد میں دونوں جہاں کو بھول گیا

حریمِ سجدہ تری جلوہ گاہ تھی کہ کوئی
جبیں کو بھول گیا آستاں کو بھول گیا

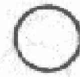
مگر فریبِ تبسم میں آگیا ہے دل
کہ تیری بزم میں آہ و فغاں کو بھول گیا

جنونِ شوقِ طلب میں ہے شانِ بے خبری
میں کارواں میں ہوں اور کارواں کو بھول گیا

نثار اس پہ دل و جانِ انفس و آفاق
ترے حضور جو کون و مکاں کو بھول گیا

ذھین ان کی حضوری تھی اپنی مستوری
پڑا یقین کا پرتو گماں کو بھول گیا

۲۴ مئی ۱۹۳۳ء



اہلِ محفل کو نہیں یاد خود اپنا ہونا
ہم نے دیکھا ہے ترا بزم میں تنہا ہونا

مجھ سے روپوش ہے کیوں "جلوۂ نظارہ نقاب"
کیا مری آنکھ کو آتا نہیں پردا ہونا

ان سے ملتے ہیں نہیں جن کو تمنا اُن کی
وہ نہیں چاہتے پابندِ تمنا ہونا

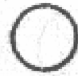
میری واماندگیٔ کیف ہے تمہیدِ سرور
غمِ امروز کو ہے عشرتِ فردا ہونا

ہوں وہ محرومِ تمنا کہ میسّر نہ ہُوا
میری بیداریوں کو خوابِ زلیخا ہونا

ختم ہو جائیں گی اک روز حدیں ضبط کی بھی
غمِ جاناں کے مقدر میں ہے رُسوا ہونا

مسکراتے ہوئے ہم جلوۂ ایمن دیکھیں
شرط ہے واقفِ آدابِ تماشا ہونا

مر گیا سُنتے ہیں فرقت میں تری آج ذہین
ہو مبارک ترے بیمار کو اچھا ہونا



بیگانگیٔ عشق ہے بیگانہ سمجھنا
ہر جلوہ یہاں جلوۂ جانانہ سمجھنا

محدود نہ تم جلوۂ جانانہ سمجھنا
کعبے کو سمجھنا ہے تو بتخانہ سمجھنا

آزادِ نگاہی بھی تو آخر کوئی شے ہے
کیا فرض ہے بت خانے کو بتخانہ سمجھنا

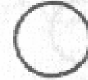
ہر رنگ میں ہے حُسن، محبت ہی محبت
تم شمع کو بھی دیکھو تو پروانہ سمجھنا

یہ عالمِ مستی ہے کہ ہے مستیٔ عالم
میں ہوش میں آ جاؤں تو دیوانہ سمجھنا

جب تک نگہِ شوق گرفتارِ ادب ہے
ہر ذرے کو قفلِ درِ میخانہ سمجھنا

کیا آپ ذہین اپنی حقیقت کو سمجھتے
ہے رازِ محبت کا سمجھنا نہ سمجھنا

گنگاپور — مارچ ۱۹۳۸ء



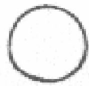
بیانِ حسن کو افسانۂ حسنِ نظر پایا
تری جلوہ گری میں ہم نے خود کو جلوہ گر پایا

تمہارا ذکر کیا ہم نے تمہارے پانے والوں کو
حدودِ امتیازِ کفر و ایماں سے اُدھر پایا

دلِ دیر و حرم ہے باہزاراں یادِ نامحرم
ترے مستوں نے تجھ کو بیخودی میں بھول کر پایا

کہاں شیخ و برہمن آشنائے رازِ مستی ہوں
کہ تم کو ہم نے اپنے آپ سے بھی بے خبر پایا

ذھینِ یوسفی گم آپ کس کی جستجو میں ہیں
کہ ہم نے آپ کو کھویا ہوا ہی بیشتر پایا



حجاب جلوہ ہے جلوہ حجاب ہے اپنا
وہ لاجواب تجلی جواب ہے اپنا

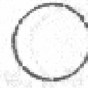
وہاں سکون میں بھی اضطراب ہے اپنا
مگر مذاقِ جنوں کامیاب ہے اپنا

نفس نفس ہے نظر کاروانِ رنگ و بو
مری نگاہ میں وہ آپ خواب ہے اپنا

کمالِ حسن کا ذوقِ خود آگہی بھی نہیں
جہاں جمالِ نظر باریاب ہے اپنا

ترا جمال یہی کہ نظر ہے اپنی جمیل
ترا شباب یہی کہ شباب ہے اپنا

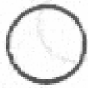
ذھینؔ ہے مری مستی کی مہتمم ہستی
یہاں جو ذرہ ہے جامِ شراب ہے اپنا



شوق کامل ہے تو ذوقِ خام کیا | عشق میں آغاز کیا انجام کیا
آرزو ہے خود فریبِ آرزو | کامیابی اے دلِ ناکام کیا
عشق میں مٹنا مسلم ہے تو پھر | آرزو ہائے نمود و نام کیا
تیری بیگانہ نگاہی کے نثار | شکوہ ہائے گردشِ ایام کیا
برق و خرمن کا تعلق، جز فنا | ہم کو تم سے تم کو ہم سے کام کیا
ہے تجھی سے زینتِ دیر و حرم | تو نہیں تو کفر کیا اسلام کیا
یہ بھی ہے خاصانِ الفت پر ستم | ورنہ ظالم تیرا لطفِ عام کیا
آکہ دونوں وقت ملتے ہیں ملیں | یاد ہم رکھیں گے کوئی شام کیا

زلف آشفتہ ہے آج ان کی ذھین
ہو گئی بیمارِ غم کی شام کیا

سرائے کماد عونپور ۴ر مئی ۱۹۳۳ء



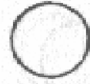
ہم نے اُس جانِ چمن کو چمنِ جاں دیکھا
دیکھ کر اُس کو بہاروں کو پشیماں دیکھا

میں ہی میں جلوہ گہِ حسن میں تھا جلوہ نما
عشق کو انجمنِ ناز میں نازاں دیکھا

چاند سورج نے نہ دیکھا کبھی عریاں جس کو
ہم نے اُس حسنِ ضیا پوش کو عریاں دیکھا

اپنی منزل سے جو باہر کہیں آیا نہ گیا
میری منزل کی طرف اس کو خراماں دیکھا

اس نے پہلے پہل آدابِ محبت سیکھے
عشق پر حسن کو مائل بدل و جاں دیکھا



درس آموز ہوا درس گہِ عشق میں حُسن

عقلِ کُل کو بھی جہاں طفلِ دبستاں دیکھا

جب سنی پہلے پہل حسن کے دل کی دھڑکن

ہم نے وارفتگیٔ عشق کو نازاں دیکھا

جاگ اٹھے سازِ دلِ حُسن میں سوئے ہوئے گیت

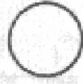
حسنِ خاموشِ غزالہ کو غزل خواں دیکھا

قابلِ دید ہے دنیائے محبت، کہ جہاں

کوئی کافر نظر آیا نہ مُسلماں دیکھا

سر بگردوں نظر آتا ہے وہی حُسن ذہین

جانے کس فکر میں گم سر بگریباں دیکھا



بقدرِ ذوقِ نظر دل خراب ہو نہ سکا — وہ بے حجاب مگر بے حجاب ہو نہ سکا

نہیں کہ ذوقِ نظر فیضیاب ہو نہ سکا — کہاں حجابِ تجلّی مآب ہو نہ سکا

نگاہِ مست کے مستوں کی خاص قسمت ہے، — جو کیف قسمتِ جامِ شراب ہو نہ سکا

نگاہِ شوق کو شامل کئے بغیر کبھی — مذاقِ جلوہ گری کامیاب ہو نہ سکا

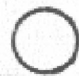
خوشا نصیبِ محبت کہ بزمِ امکاں میں — نہ ہو سکا کہ کوئی بے نقاب ہو نہ سکا

کبھی نگاہِ کرم آئینے کے دل سے پوچھ — یہی سوال کہ تیرا جواب ہو نہ سکا

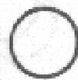
بنے ہیں ساحل و گرداب شرحِ ہمت و عجز — سکون ہو گیا جو اضطراب ہو نہ سکا

ذہین جانتے ہیں خوب ہم حقیقتِ حشر

وہ فتنہ ہے جو کسی کا شباب ہو نہ سکا



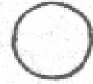
دل جا رہا ہے ہاتھ سے ہاتھ آ رہا ہے کیا
سمجھا ہے دل نے کیا مجھے سمجھا رہا ہے کیا
حدِ نظر سے دُور نظر آ رہا ہے کیا
دل تجھ سے بے حجاب ہوا جا رہا ہے کیا!
چشمِ حیا کو آئینہ دکھلا رہا ہے کیا
دل آرزوئے شوق سے شرما رہا ہے کیا!
تیری طرف نگاہ تھی لغزشِ نگاہ کی
کیا مانگتا ہے ذوقِ نظر پا رہا ہے کیا
تھا شرط جس کی یاد میں ہر شے کو بھولنا
ہر شے کی یاد سے وہی یاد آ رہا ہے کیا
میں نے ذہینؔ جس پہ لٹائی تھی زندگی
وہ میری زندگی ہی بنا جا رہا ہے کیا



وہ چشمِ میگوں جامِ محبت — وہ خاص کیفِ عامِ محبت
بدنام ہونا، نامِ محبت — ناکامیاں ہیں کامِ محبت
روشِ ہوا پر گیسوئے رقصاں — ذوقِ اسیری دامِ محبت
زنجیر پائے موجِ صبا ہے — خوشبوئے گیسو دامِ محبت
اپنی محبت مقصود اپنا — ناکام ہیں ناکامِ محبت
کیا پیارے پیارے ہیں نام دل کے — طورِ تجلی بامِ محبت
رہنِ محبت اسبابِ ہستی — نقدِ دل و جاں دامِ محبت
وہ روئے رنگیں، وہ زلفِ شبگوں — صبحِ محبت، شامِ محبت
معنئ ازل کے مطلب ابد کا — صبحِ محبت، شامِ محبت

مسلکِ ذہینِ تاجی ہمارا
تعظیمِ دل، اکرامِ محبت

۵ اپریل ۱۹۵۹ء شب



میں کیا کہوں کہ دُور ہو تم اور کہاں سے دُور
دل سے مرے کہ سرحدِ کون و مکاں سے دور

جُز آرزوئے مرگ کرے کیا بہار میں
بے پر۔ اسیرِ کُنجِ قفس آشیاں سے دُور

اتنے ہی وہ قریب ہیں میرے خیال سے
جتنا سمجھ رہا ہوں میں وہم و گماں سے دُور

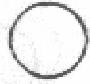
غم نے کبھی ساتھ چھوڑ دیا ہائے عشق میں
آنسو الگ ہیں آنکھ سے نالے زباں سے دُور

انکارِ مے نہ کیجئے رندوں میں بیٹھ کر
یہ بات ہے طریقۂ پیرِ مغاں سے دُور

ذروں کی انجمن ہو کہ تاروں کی جلوہ گاہ
تم ہو یہاں سے دور نہ تم ہو وہاں سے دُور

ہمدم ہے دل کو آرزوئے لذّتِ سکوں
لے چل کہیں خلش کدۂ این و آں سے دُور

دشتِ طلب میں حالِ خرد کیا کہوں ذہین
گُم کردہ راہ خاک بسر کارواں سے دُور



تھی نظر اِن بتوں کی صورت پر
پڑ گئی آنکھ حُسنِ فطرت پر

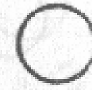
میری توہین کس کی ہے توہین
غور کر ربطِ حُسن و الفت پر

مجھ کو اب تو یقین ہوتا ہے
تیری صورت کا اپنی صورت پر

حُسنِ کافر نہ یوں ہو بیگانہ
میرا ایمان ہے محبت پر

تھا شبابِ جہاں جہانِ شباب
نہ رہا دو دن ایک حالت پر

تجھ پہ مر کر ذہین زندہ ہے
موت بہتان ہے محبت پر



کیا ظلم ستم تو نے ستم پر
گرا دیں بجلیاں احساسِ غم پر

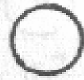
اتر آتے ہیں تارے مسکرا کر
شبِ غم آسماں سے چشمِ نم پر

یہ کیفِ بے خودی کی خامیاں ہیں
نہیں تیری طلب کچھ فرض ہم پر

جہاں ہم ہیں ہمارے ساتھ ہیں وہ
نہیں موقوف کچھ دیر و حرم پر

یہاں سابق عدم لاحق عدم ہے
یہاں بنیادِ ہستی ہے عدم پر

نظر حسنِ عمل پر زاہد دل کی
ذہین اپنی نظر ان کے کرم پر



جانا ترا او مستِ مئے ناز وہ آ کر
وہ ہوش میں آنا مجھے دیوانہ بنا کر

پھر کوئی تبسم دلِ افسردہ کے حق میں
پھر دیدۂ ویراں کو کوئی جلوہ عطا کر

ہاں عشق ابھی عشق ہے ہاں حسن ابھی حسن
ہاں مجھ سے بہت دور ہیں وہ مجھ میں سما کر

ہر جلوۂ عریاں میں کئی جلوۂ پنہاں
سو پردے گراتے ہیں وہ اک پردہ اٹھا کر

شاید کہ ابھی دیدۂ و دل ایک نہیں ہیں
دنیا وہ بدل جاتے ہیں دل کی، نظر آ کر

افسانۂ مستی ہے نگاہوں کی زباں پر
سو جائے اگر دل تو سناتے ہیں جگا کر

دیوانوں کو دیکھا تو عجب حال ہے ان کا
ہنستے ہیں ہنسا کر کبھی روتے ہیں رُلا کر

آپ اپنے سے چھپ کر کبھی آجاتے ہیں مجھ تک
مجھ کو کبھی لے جاتے ہیں خود مجھ سے چھپا کر

بت خانے کو لا رکھتے ہیں کعبے میں کبھی ہم
بت خانے میں لے آتے ہیں کعبے کو اٹھا کر

پوجی گئی تصویر تری دیر و حرم میں
تمثیل میں لا کر کہیں تخئیل میں لا کر

توچاہے تو ہم اہلِ ادب ، اہلِ محبت
دیکھیں تجھے ہر ذرے کی محفل میں سجا کر

میخانہ ذھین اصل میں اللہ کا گھر ہے
ہر جام پہ اک سجدۂ تعظیم ادا کر



بندِ نقاب وا نہوا وا کئے بغیر
اٹھا نہ یہ حجاب تقاضا کئے بغیر

دنیا میں وجہ برہمئ دل نہیں کوئی
پہچانتا ہوں تم کو تماشا کئے بغیر

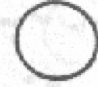
معصومیت یہ حُسنِ تمنا نواز کی
شرما گئے وہ عرضِ تمنا کئے بغیر

گر بے حجابیوں میں بھی مقصود ہے حجاب
ہم سامنے نہ آئیں گے پردا کئے بغیر

میرا عدم ہے ہستئ برباد کی دلیل
ممکن نہیں حجاب ہو جلوا کئے بغیر

میں ہوں فریب خوردۂ نیرنگِ آرزو
ملتے ہیں ورنہ آپ تمنا کئے بغیر

تنہائی خیال مجھے مل گئی ذھین
دنیا کو نذرِ شورشِ دنیا کئے بغیر



کون یارب ہے زمزمہ پرداز
ایک عالم ہے گوش بر آواز

رنگِ صورت ہے مائلِ پرواز
آج غم ہوگیا ہے خود غمّاز

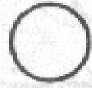
ہر تکلم سے ہر خموشی سے
سن رہا ہوں میں آپ کی آواز

حُسنِ خود بیں یہ دیکھتا ہی نہیں
آئینہ دوست ہے کہ ہے غماز

ہم نہ دیکھیں تو کم نگاہی ہے
ورنہ ہر ذرہ ہے جہانِ راز

کل غزل خواں تھے آج مہر بلب
اف یہ انجام ہائے وہ آغاز

بازگشتِ صدائے کن ہے ذھین
سارا عالم ہے عالمِ آواز

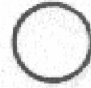


پہچانتے ہیں آگہی سے بےخودی کو ہم
پھر آج تجھ سے مانگ رہے ہیں تجھی کو ہم

پھر ہوش آ چلا ہے تری جلوہ گاہ میں
پھر بیچتے ہیں ایک نظر میں خودی کو ہم

پھر لوٹ لے گیا وہ تبسّم متاعِ درد
پھر آج رو رہے ہیں غمِ رفتنی کو ہم

قیمت میں اک نظر کی غمِ جاوداں ملا
کیا اے ذھین یاد کریں گے کسی کو ہم



مسرتوں کی حقیقت سے باخبر ہوں میں
شگفتہ تر ہے چمن تو فسردہ تر ہوں میں

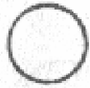
کبھی یہ میں نے نہ دیکھا کہ میرا حال ہے کیا
پھری ہوئی ہے جو مجھ سے تری نظر ہوں میں

تری تلاش میں منزل بھی، رہگذر نکلی
ہر اک مقام پہ آمادۂ سفر ہوں میں

غلط، کہ آپ خدائے دل و نگاہ نہیں
بجا کہ صاحب دل، صاحبِ نظر ہوں میں

یہ دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ کو دیکھتے ہیں ذہین
یہی سبب ہے کہ خودبین و خودنگر ہوں میں

جے پور ۱۹۴۴ء



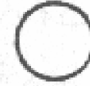
وہ راز ہوں کہ فسانہ، جہانِ راز میں ہوں
جہاں کہیں بھی ہوں میں تیری بزمِ ناز میں ہوں

زہے حجاب کہ ہے تو ہی تو حقیقت میں
کمالِ جلوہ گری میں ہی میں مجاز میں ہوں

جہان میرے لئے ہے جہانِ دیدہ و دل
یہ امتیاز سے نکلا کہ امتیاز میں ہوں

تری ادائیں نہ چھیڑیں تری نظر نہ لگائے
میں ایک نغمۂ آسودہ خوابِ ساز میں ہوں

نیازِ عشق ذہین آج ہے حقیقتِ ناز
ہزار ناز وہاں ہیں جہاں نیاز میں ہوں



کیا دوامِ غمِ الفت سے بھی محروم ہوں میں
کبھی مغموم نہیں ہوں کبھی مغموم ہوں میں

ان معاصی پہ بھی اللہ یہ رحمت، یہ یقیں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ معصوم ہوں میں

یہ عدم ہے کہ مجھے علم نہیں کچھ اپنا
میری ہستی ہے فقط یہ، تجھے معلوم ہوں میں

آج تک آ نہ سکا فہمِ دو عالم میں ذہین
وہ کسی کی نگہِ ناز کا مفہوم ہوں میں



میں ہوں اور تجھ سے مناجاتیں ہیں
غم کی راتیں بھی عجب راتیں ہیں

بے خودی پھر ہے کسی کی آغوش
پھر تصور میں وہی باتیں ہیں

پھر وہی دل کی گرج اور کڑک
پھر وہی آنکھ کی برساتیں ہیں

زلف و رخ پیشِ نظر آٹھ پہر
پھر وہی دن ہیں، وہی راتیں ہیں

دل میں آتے ہی وہ آجاتے ہیں
پھر وہی دل کی کراماتیں ہیں

حاصلِ زیست حقیقت میں ذہین
ان سے دو ایک ملاقاتیں ہیں



تجھ میں مجھ میں حجاب تھا ہی نہیں
تھا اگر کامیاب تھا ہی نہیں

یوں مخاطب تھے مجھ سے وہ سرِ بزم
جیسے مجھ سے خطاب تھا ہی نہیں

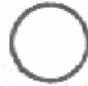
اُن کے آتے ہی کیا ہوا دل کو
دل میں کیا اضطراب تھا ہی نہیں

دل نے ہر شے میں تجھ کو دیکھ لیا
ورنہ تیرا جواب تھا ہی نہیں

رات دن مرکزِ نظر تم تھے
ماہتاب آفتاب تھا ہی نہیں

کیوں نہ دوزخ ہو عاشقوں پہ حرام
عشق کا سا عذاب تھا ہی نہیں

وہ نہ بدلے نہ ہم ذھین کبھی
دہر میں انقلاب تھا ہی نہیں



متاعِ ہوش و خرد کو لُٹا رہا ہوں میں
نہ آکے دوست ترے پاس آ رہا ہوں میں

فدائے شوقِ خودی کو بنا رہا ہوں میں
ترا ہی آئینہ تجھ کو دکھا رہا ہوں میں

تری نظر سے نظر کیا ملا رہا ہوں میں
ہر ایک منظرِ ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

کچھ اس ادا سے مجھے یاد آ رہے ہیں وہ
یقین ہے کہ انھیں یاد آ رہا ہوں میں

ہزار جلوۂ عُریاں لئے ہوئے دل میں
خود اپنی آنکھ سے تجھ کو چھپا رہا ہوں میں

کسی کے شعلۂ رخسار کی تمنّا میں
چراغِ دیر و حرم میں جلا رہا ہوں میں

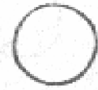
گناہ شرکِ محبت، خدا معاف کرے
تمہاری یاد سے تسکین پا رہا ہوں میں

ذھین کب ہے نظر کا معاملہ ان سے
خود اپنے حُسن پہ قربان جا رہا ہوں میں

میں تجھ کو بھول جاؤں نہیں اور کبھی نہیں
وارفتگی بہانۂ وارستگی نہیں
میں منفعل ہوں نزع میں خود شوقِ دید پر
ہاں وہ نظر بہائے غمِ زندگی نہیں
روتا ہے آج تک تری پہلی نظر کو دل
ایسی لگی ہے آگ کہ اب تک بجھی نہیں
مسجودِ حسیات، پرستیدۂ خیال
کیا تیری جلوہ گاہ مری بے خودی نہیں
اب تو ہی تو ہے بزم میں اے حسنِ بے نیاز
محفل کو دیکھتا ہوں کوئی غیر ہی نہیں
ایسی اٹھی نظر کہ نہ دیکھا کسی کو پھر
ایسی جھکی جبیں کہ کہیں پھر جھکی نہیں
پاتا ہوں اپنی سانس میں بھی اب تو بوئے دوست
کہتا ہے کون وصل کی لذت ملی نہیں
ہرگز ذہین بزمِ جہاں سے نہ اٹھ سکا
جب تک نقاب آپ کے رخ سے اٹھی نہیں



وہ دلنواز تجلی فرازِ بام نہیں
جمالِ خاص نصیبِ نگاہِ عام نہیں
تری طلب یہ بجا ہے کہ ذوق خام نہیں
وہاں ہے عشق جہاں کچھ کسی کو کام نہیں
زہے نگاہ، زہے دل، زہے جنوں زہے ہوش
ترا فسانہ کہیں سے بھی ناتمام نہیں
تمہاری بزم میں ہر دل بقدرِ ظرف ہے مست
کچھ اہتمام ہے ایسا کہ اہتمام نہیں
حقیقتِ مے و مینا نہ ہے یہ مستیٔ حسن
ادا شراب نہیں یا نگاہ جام نہیں
یہ قامت آہ قیامت ہے کب ہے سربسجود
ازل سے تا بہ ابد فرصتِ قیام نہیں
محبت آپ ہی مقصود ہے محبت میں
یہی ہے کام ہمارا کہ کوئی کام نہیں
نہیں ذہین کے شربِ مدام کی وہ شراب
کبھی حلال نہیں جو کبھی حرام نہیں



کیا حُسن پردہ دار تجھے پردہ در کہوں
سنکر جو کہہ رہا تھا وہی دیکھ کر کہوں

حُسنِ نظر ہو تم، نظرِ حُسن ہے یہ دل
اب دل ہی دل کہوں کہ نظر ہی نظر کہوں

تم میں نظر نظر ہے تمہیں تم نظر میں ہو
اپنی نظر کہوں کہ تمہاری نظر کہوں

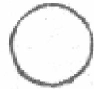
عالم تمام، عالمِ ذوقِ نگاہ ہے
جلوہ کسے کہوں میں کسے جلوہ گر کہوں

کون و مکاں بہائے خطابِ جنوں کہاں
کس طرح اہلِ ہوش کو میں بے خبر کہوں

دل ہے بہائے بے خبری، دوجہاں نہیں
کس طرح دوجہاں کو دلِ بے خبر کہوں

فی الجملہ شورِ عشق ہے موسیقئ جمال
تو ہی مری مراد ہے میں بھی اگر کہوں

کہنہ سہی ذھین حکایاتِ حسن و عشق
پھر بھی ہزار بار کہوں تازہ تر کہوں



دیکھتا ہوں جب تجھے خود ہی نظر آتا ہوں میں
تیرے ہر جلوے کو اپنا آئینہ پاتا ہوں میں

ہیں ہزاروں جلوہ گاہیں، جلوہ گاہِ یار تک
رہگزر کے ذرے ذرے پر مٹا جاتا ہوں میں

حُسن سرشارِ تجلی عشق مدہوشِ جنوں
تجھ سے تجھ کو خود کو خود سے بے خبر پاتا ہوں میں

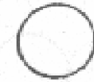
ہر بُنِ مو کی زباں پر نام ہوتا ہے ترا
یاد میں تیری مجسم درد بن جاتا ہوں میں

تم کو شکوہ ہے فراموشی کا مجھ سے یا مجھے
جب کبھی تم یاد آتے ہو تو یاد آتا ہوں میں

سیکڑوں سجدے کئے دل نے نگاہِ شوق نے
پھر بھی تیرے در کے ہر ذرے سے شرماتا ہوں میں

مُسکراتی ہے وہی تصویر ہر آنسو میں دیکھ
چشمِ گریاں اُس تبسم کی قسم کھاتا ہوں میں

کہہ گئیں کس کی نگاہیں مجھ کو اپنا اے ذھین
اب تو خود اپنے تصور سے بھی گھبراتا ہوں میں



دیکھا تو تھا کسی کو دنیائے بے خودی میں
ممکن ہے کھو گئی ہو میری نظر مجھی میں

کہتا ہوں ہم نشینو! رہنے دو بے خودی میں
سَو بار آ چکا ہوں اک ہوشِ رفتنی میں

وہ چھپ گئے حریمِ اندازِ دلبری میں
اک آگ سی لگا کر جذباتِ عاشقی میں

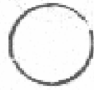
کہرام پڑ گیا ہے دُنیائے عاشقی میں
تو نے اڑائے ظالم! نالے مری ہنسی میں

اک یاد میں تمہاری ہیں سَو ادائے مستی
پھر ہوش بھی ہے داخل آدابِ بندگی میں

محوِ وصال ہونا اک عشرتِ فنا ہے
آؤ ملیں کسی سے، آؤ ملیں کسی میں

مایوس کیوں ہو کوئی جور و کرم نما سے
روتے رہو ہمیشہ، کہہ جاؤ یہ ہنسی میں

سب کچھ ہے جذبِ الفت مانا ذھین لیکن
اول تو وصل ان کا پھر یہ کہ زندگی میں



دل میں اب کوئی آرزو ہی نہیں — کوئی موضوعِ گفت گو ہی نہیں

کیجیے عرضِ موسمِ گل کیا؟ — جب مرا عہدِ رنگ و بو ہی نہیں

اپنی منزل کو اور کھو بیٹھا — مجھ سا ناکامِ جستجو ہی نہیں

نظر انداز کر نہ حُسنِ نظر — حسن والے حسین تو ہی نہیں

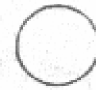
واہ اظہارِ شانِ یکتائی — آئینہ ہے کہ روبرو ہی نہیں

انبساطِ خیال میں بھی ہے — کیف منت کشِ سبو ہی نہیں

بس ہوئی اک نقاب کی جنبش — طور پر کوئی روبرو ہی نہیں

لن ترانی پر اے کلیم! اصرار — پاسِ آدابِ گفتگو ہی نہیں

فیضِ قدرت ذھین یکساں ہے
کوئی تخصیصِ لکھنؤ ہی نہیں



جہان کو میں جہانِ نظر سمجھتا ہوں
ہر آئینے میں تمہیں جلوہ گر سمجھتا ہوں

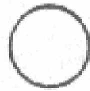
تری نگاہ کی نیرنگیاں معاذ اللہ
کہ ہر نظر کو میں اپنی نظر سمجھتا ہوں

یہ ابتدا ہی محبت کی انتہا بھی ہے
میں مبتدائے جنوں کی خبر سمجھتا ہوں

بدل دیا ہے جہانِ نظر جنوں میں مگر
تری نظر کو تری ہی نظر سمجھتا ہوں

محبت اب بھی محبت ہے حسن اب بھی حسن
وہ لاکھ پاس ہوں میں دور تر سمجھتا ہوں

ورائے فہم ہے رازِ جنونِ شوق ذہین
سمجھ میں آ نہ سکا کچھ مگر سمجھتا ہوں



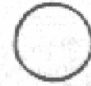
اب وہ امید ہے، نہ خلش ہے، نہ آرزو
ترکِ امید و شوق و تمنا ہے اور میں

کوئی تلاش ہے، نہ طلب ہے، نہ جستجو
اب لذتِ شکستگیٔ پا ہے اور میں

خواہش کلام کی نہ تمنائے گفتگو
میرے لئے سکوت کی دنیا ہے اور میں

میری نگاہ میں ہے یہ عالم مقامِ ہو
بے رنگیوں کا عالمِ تنہا ہے اور میں

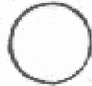
تعبیرِ کائنات حقیقت میں اے ذہین
میرا خیالِ انجمن آرا ہے اور میں



عیاں نہیں تو یہ دیکھا کہ وہ نہاں بھی نہیں
مگر یقین نہیں ہے تو پھر گماں بھی نہیں

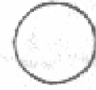
متاعِ دل ہے تو غارت گرانِ دل ہیں بہت
جہاں بہار نہیں ہے، وہاں خزاں بھی نہیں

اب آشیانے کی خیر و خبر ملے کس سے؟
کہ دور دور کہیں برقِ آشیاں بھی نہیں



بن بن کے مٹ گیا ہوں مٹ مٹ کے بن گیا ہوں
وہ نقشِ آرزو ہوں وہ حرفِ مدعا ہوں
یں اپنی وسعتوں میں گم ہوگیا ہوں ایسا
ہر قیدِ جستجو سے آزاد ہوگیا ہوں
مجھ کو اٹھانے والے رسوا کہیں نہ ہونا
میں پردہ بن کے تیرے در پر پڑا ہوا ہوں
کس کی نظر سے دیکھوں تیری تجلیوں کو
تو کب ملا ہے مجھ سے جب میں نہیں رہا ہوں
سب تار بج رہے ہیں اب تیرے سازِ ہستی
ہر سانس کہہ رہا ہے میں دردآشنا ہوں
میں اپنی زندگی کو تجھ پر نثار کرتا
اے کاش تو نہ کہتا :- میں صبر آزما ہوں
کافر ہو جس کے دل میں ہو لطف کی تمنا
میں تو جفائے جاناں ! دلدادہ جفا ہوں
اب تو ذہین میں بھی دنیائے جستجو میں
تصویرِ نارسی ہوں تعبیرِ خواب یا ہوں

BZSTRFT



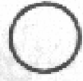
حقیقت اور صُوَرِ عارضی کے پردے میں
حجاب اور مری بے پردگی کے پردے میں

مری نظر ہے شناسائے شانِ روپوشی
کسی کو دیکھ رہا ہوں کسی کے پردے میں

نظامِ منعِ تماشائے حُسن کے صدقے
وہ آئے بھی تو مری بیخودی کے پردے میں

نویدِ جذبِ نظر! اب ہے ایک ہی عالم
کسی کے پردے کے باہر کسی کے پردے میں

ذہین آپ ہیں محوِ خیالِ دید مگر
گئے وہ بزم میں آکر کبھی کے پردے میں



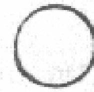
نگاہِ مستِ ساقی سے یہی ہم کام لیتے ہیں
شراب اپنے لئے بے شیشہ و بے جام لیتے ہیں

محبت ناخدا ہے دل ہے کشتی. شوق ہے دریا
ہم اپنے سر کہیں اندیشۂ انجام لیتے ہیں

کوئی کب اجتنابِ حُسن کے معنیٰ یہ سمجھیگا
بچاتے ہیں جو دامن، دامنِ دل تھام لیتے ہیں

تمہارا نام کیا لکھا ہوا ہے میری صورت پر
جو مجھ کو دیکھتے ہیں کیوں تمہارا نام لیتے ہیں

ذہین اپنے لئے کیفِ خودیٔ عشق کافی ہے
نہ ہستی رہن رکھتے ہیں نہ مستی وام لیتے ہیں



جدھر سے وہ گزرتے جا رہے ہیں　　دلوں میں کیف بھرتے جا رہے ہیں

چلے جاتے ہیں اس انداز سے وہ　　کوئی جانے ٹھہرتے جا رہے ہیں

نگاہیں اُن پہ جتنی پڑ رہی ہیں　　نکھرتے ہی نکھرتے جا رہے ہیں

سنورنے کا نہیں ہے دھیان لیکن　　سنورتے ہی سنورتے جا رہے ہیں

جہاں جانے میں کوئی ڈر نہیں ہے　　وہاں ہم ڈرتے ڈرتے جا رہے ہیں

میں رہ رہ کر سمجھتا ہوں کہ سچ ہے　　وہ کہہ کہہ کر مکرتے جا رہے ہیں

یہ کیا ارمان کیسے ولولے ہیں　　دبانے سے ابھرتے جا رہے ہیں

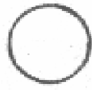
وہ اپنا کام کرتے جائیں اچھا　　ہم اپنا کام کرتے جا رہے ہیں

ہم ان کے دل سے جب اترے ہوئے ہیں　　وہ کیوں دل میں اترتے جا رہے ہیں

نئی باتیں، نئی گھاتیں نئے ڈھنگ　　یہ کیا برتاؤ برتے جا رہے ہیں

جو ہر الزام کے ملزم ہیں خود ہی　　وہی الزام دھرتے جا رہے ہیں

ذھین اک لمحہ تم سے مانگتا ہے　　سنہرے دن گزرتے جا رہے ہیں



میں ہوش میں ہوں تو تیرا ہوں دیوانہ ہوں تو تیرا ہوں

ہوں راز اگر تو تیرا ہوں افسانہ ہوں تو تیرا ہوں

برباد کیا برباد ہوا ، آباد کیا آباد ہوا

ویرانہ ہوں تو تیرا ہوں کاشانہ ہوں تو تیرا ہوں

اس تیری تجلی کے قرباں قربانِ تجلی ہر عنواں

میں شمع بھی ہوں تو تیرا ہوں پروانہ ہوں تو تیرا ہوں

تو لاکھ حجاب کرے مجھ سے یا کوئی پردہ ہی نہ رہے

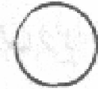
میں ہوں تو یگانہ تیرا ہوں بیگانہ ہوں تو تیرا ہوں

تو میرے کیف کی دنیا ہے تو میری مستی کا عالم

پیمانہ ہوں تو تیرا ہوں میخانہ ہوں تو تیرا ہوں

ہر ذرہ ذھین کی ہستی کا تصویر ہے تیری سر تا پا

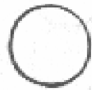
او کعبۂ دل ڈھانے والے بت خانہ ہوں تو تیرا ہوں



جز روئے دوست کچھ بھی نہیں دیکھتا ہوں میں
بیداریوں میں خوابِ حسیں دیکھتا ہوں میں

یہ انتہائے عشق بھی ہے منتہائے حسن
خود کو جہاں تھے آپ وہیں دیکھتا ہوں میں

آسودہ مہر و ماہ تہِ خاک ہیں ذہین
تو آسمان زیرِ زمیں دیکھتا ہوں میں



کرمِ پیرِ مغاں عام ہے میخانے میں
دو جہاں ایک چھلکتے ہوئے پیمانے میں

کل جو میں کہتا تھا ساقی ترے میخانے میں
اک وہی لفظ ہے منصور کے افسانے میں

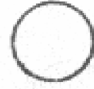
ہوش میں بھی نہیں اور ہوش سے باہر بھی نہیں
کون سی بات ہے آخر ترے دیوانے میں

ہستیٔ دہر ہے موقوف مری ہستی پر
سو قیامت ہیں نہاں اک مرے مٹ جانے میں

عام تھا فیض مگر تیری نظر کے قرباں
لوگ پوچھا کئے کیا تھا ترے پیمانے میں

ذوقِ تکمیل ہے غالب غمِ بربادی پر
ایک لطف آتا ہے بن بن کے بگڑ جانے میں

نہیں اصنام تو کیا رہ گیا کعبے میں ذہین
ہم تو کعبے کو اٹھا لائے صنم خانے میں



رونے سے خموشی میں معذور نہیں ہوں میں
آزادیٔ گریہ ہے مجبور نہیں ہوں میں

احساسِ طلب تک تھی بیگانگیِ منزل
اب دور ہوں منزل سے اور دور نہیں ہوں میں

غم اور مسرت تک خامی تھی محبت میں
مغموم نہیں ہوں میں مسرور نہیں ہوں میں

وصل اور جدائی کی کچھ حد تو معین ہو
وہ پاس کہاں سے ہوں جب دور نہیں ہوں میں

سمجھو تو انا الحق کے معنیٰ ہیں ذھین آساں
دراصل یہ کہتا تھا منصور "نہیں ہوں میں"

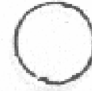


تم سے ہے رسم و راہ کسی اور سے نہیں
ملتی ہی یہ نگاہ کسی اور سے نہیں

یہ اور بات ہے کہ اڑائیں ہنسی میں آپ
ورنہ خطاب آہ کسی اور سے نہیں

اس حسنِ بے پناہ سے ہوں طالبِ پناہ
میں مانگتا پناہ کسی اور سے نہیں

میخانے میں ذھین کے دم سے ہیں رونقیں
آباد خانقاہ کسی اور سے نہیں



جانِ بہار بن کر آئے ہیں وہ چمن میں
پھولے نہیں سماتے گُل اپنے پیرہن میں

غم میں کوئی خوشی کا پہلو نکل نہ آئے
محسوس ہو رہی ہے ٹھنڈک سی کیوں جلن میں

پروانہ خاک سمجھے کیا شمع کو خبر ہو
چپ چاپ جل رہا ہے دل تیری انجمن میں

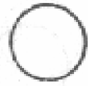
کیا آنکھ بند رکھنا آدابِ بزم میں ہے
تجھ کو ہی ہم نہ دیکھیں تیری ہی انجمن میں

اس خاکِ آستاں سے تعمیرِ دل ہوئی تھی
اچھا ہوا وطن کی مٹی رہی وطن میں

وہ ہوشیار آنکھیں درسِ جنوں ہیں یعنی
شامل ہے ہوشیاری دیوانگی کے فن میں

کھوئی ہوئی سی ہر شے معلوم ہو رہی ہے
کیا چیز بھول آیا میں تیری انجمن میں

دل جھومنے لگا ہے شعرِ ذہین سُن کر
کیفیتیں نئی ہیں اس بادۂ کہن میں



ہر فکرِ زندگی سے بے گانہ ہو گیا ہوں
ہشیار ہو گیا ہوں دیوانہ ہو گیا ہوں

مجھ سے ہی تھا عبارت رازِ حدیثِ الفت
دیکھو مجھے کہ اب میں افسانہ ہو گیا ہوں

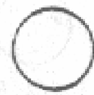
کیوں چھیڑتی ہیں مجھ کو وہ ہوشیار آنکھیں
کیا جانے کیا سمجھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں

اللہ رے کمالِ اعجازِ چشمِ ساقی
ہر جرعہ کہہ رہا ہے پیمانہ ہو گیا ہوں

میں دل میں لے چلا ہوں جو کچھ تھا انجمن میں
یعنی حریفِ شمع و پروانہ ہو گیا ہوں

کفرِ حرم پرستی مجھ کو معاف کرنا
میں اب مری نظر میں بتخانہ ہو گیا ہوں

کب التفاتِ ساقی مجھ پر ہوا ہے دیکھا
جب میں ذہین خاکِ میخانہ ہو گیا ہوں



سونی سونی ہے یہ دنیا اس کو ہم آباد کریں
تم بھی ہم کو یاد کرو پھر ہم بھی تم کو یاد کریں

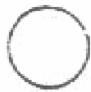
مہر و وفا کی بھولی بسری باتیں، آؤ یاد کریں
روئیں، دھوئیں، شور مچائیں، آہ کریں، فریاد کریں

اُن کے سانسوں کی خوشبو ہم سونگھیں اپنے سانسوں سے
حسن و محبت دونوں کو آزاد رکھیں، آزاد کریں

رفتہ رفتہ بھول گئے ہیں اپنے کو ہم آپ کو ہم
آپ کبھی یاد آجائیں تو خود کو بھی ہم یاد کریں

جس دل کو برباد کریں اُس دل میں ہم آہ ذہین
اُن کو ہم آباد کریں تو کس دل سے آباد کریں

کراچی۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۱ء



حضور و غیب میں کچھ امتیاز ہو تو کہوں
حقیقت اپنی نظر میں مجاز ہو تو کہوں

حدیثِ راز ہے میرا فسانۂ الفت
یہی فسانہ جو دانائے راز ہو تو کہوں

پیامِ عشق، طلب گارِ دل نوازی ہے
اگر جہاں میں کوئی دلنواز ہو تو کہوں

ہزار شمع جلیں اور لاکھ پروانے
خود آگہی میں یہ سوز و گداز ہو تو کہوں

میں دیکھتا ہوں ہر اک شے خدا کی حمد میں ہے
صنم کدے میں کوئی بے نماز ہو تو کہوں

ذہین کثرتِ وحدت ہے جلوۂ محمود
مری نگاہ میں کوئی ایاز ہو تو کہوں

اب ذکرِ رُخ و فکرِ گیسو پابندِ غمِ ایام نہیں
وہ شام ہے جس کی صبح نہیں وہ صبح ہے جس کی شام نہیں

نامحرمِ حسنِ مخفی ہے کیا صبحِ ازل کیا شامِ ابد
آغاز ہو تو انجام بھی ہو آغاز نہیں، انجام نہیں

احساسِ غم و احساسِ طرب سب چھین لئے دل سے تو نے
تکلیف مجھے تکلیف نہیں آرام مجھے آرام نہیں

اُس حسنِ گراں مایہ سے گراں یہ عشقِ بے مایہ ہے ذھین
وہ حسن جہاں میں عام سہی، یہ دردِ محبت عام نہیں

یہ شرک ہے، تصورِ حسن و جمال میں
ہم کیوں ہیں تم اگر ہو ہمارے خیال میں

جب سے مرا خیال تری جلوہ گاہ ہے
آتا نہیں ہوں آپ بھی اپنے خیال میں

اٹھا ترا حجاب نہ میرے اٹھے بغیر
میں آپ کھو گیا ترے ذوقِ وصال میں

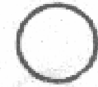
بیداریٔ حیات تھی اک خوابِ بیخودی
نیند آ گئی مجھے تری بزمِ جمال میں

اب ہر ادائے عشق میں اندازِ حسن ہے
اب میں ہی میں ہوں آپ کی بزمِ جمال میں

چھائے ہوئے ہیں حسن کے جلوے جہان پر
تم ہو خیال میں کہ نہیں کچھ خیال میں

ہاں اے خدائے حسن دعائے جنوں قبول
میں تجھ سے مانگتا ہوں تجھی کو سوال میں

حد ہو گئی فریبِ تصور کی اے ذھین
میں خود کو پیش کرتا ہوں ان کی مثال میں



نہ مشکل ہے نہ تدبیرِ غمِ آساں ہے جہاں میں ہوں
وہاں تدبیر بھی تقدیرِ انساں ہے جہاں میں ہوں

سراسر حُسنِ واجب، حُسنِ امکاں ہے جہاں میں ہوں
برابر عالمِ تن عالمِ جاں ہے جہاں میں ہوں

وہ دنیا ماورائے عقلِ انساں ہے جہاں میں ہوں
جنونِ عشق بھی سر در گریباں ہے جہاں میں ہوں

حجابِ عشق سترِ حسن پنہاں ہے جہاں میں ہوں
نگاہِ شوق جلووں کی نگہباں ہے جہاں میں ہوں

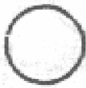
برابر ہوشیاری اور غفلت ہیں مرے حق میں
بہم حسن و جنوں میں عہد و پیماں ہے جہاں میں ہوں

مری ہستی حفاظت کر رہی ہے رازِ ہستی کی
دلِ روشن چراغِ زیرِ داماں ہے جہاں میں ہوں

یہ کس نے کہہ دیا ہے رہروانِ راہِ الفت سے
وہاں قطعاً حریمِ حُسنِ جاناں ہے جہاں میں ہوں

نہ مومن ہے نہ کافر ہے **ذہینؔ** اپنی نگاہوں میں
وہاں جلوہ گہِ اسمائے یزداں ہے جہاں میں ہوں

۲۰ جولائی ۱۹۴۴ء مشاعرہ جے پور



نہ ہو کہ بے خبرِ عشق کی خبر ہی نہ ہو
اُدھر بھی ہو یہی حالت کہیں اِدھر ہی نہ ہو

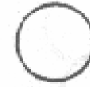
ہے جلوہ جلوہ میں یہ چشمِ خود شناس کو وہم
یہ جلوہ بھی مری کھوئی ہوئی نظر ہی نہ ہو

ہے اُن کی زلفِ پریشاں مرا فسانۂ غم
وہاں جو شام نہ ہو تو یہاں سحر ہی نہ ہو

یہ صبح و شام کوئی صبح و شام ہیں، لیکن
نہ آئیں آپ تو کیا زندگی بسر ہی نہ ہو

تڑپ رہا ہے دلِ حُسن بھی محبت میں
بایں ادا کہ محبت کا کچھ اثر ہی نہ ہو

ذہینؔ سن مری بہکی ہوئی نگاہ کی بات
یہ جلوہ دیکھ کہیں آپ جلوہ گر ہی نہ ہو



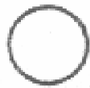
حسرتِ دید بھی ہو تابِ تماشا بھی نہ ہو
مجھ سا یارب کوئی ناکامِ تمنا بھی نہ ہو

وہ اس انداز سے بیٹھے ہیں مرے پہلو میں
جیسے وہ شخص کہ جس کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو

پردے تو جلوہ گہِ حسن سے اٹھتے ہیں، مگر
دیکھنا یہ ہے کوئی دیکھنے والا بھی نہ ہو

ہاں بجا ہے کہ میں دیوانہ ہوں، لیکن تیرا
کیا کہا ؛ نام سے تیرے کوئی رسوا بھی نہ ہو

جلوہ گر قید کے سائے میں ہے اطلاق ذھین
نہ ہو قطرہ تو کہیں نام کو دریا بھی نہ ہو



حریمِ ناز کے پردے اٹھا رہے ہیں وہ
ہر ایک ذرّے کو آب دل بنا رہے ہیں وہ

ہر ایک چیز سے میں دور ہوتا جاتا ہوں
کچھ اس ادا سے مرے پاس آ رہے ہیں وہ

نجوم رقص میں ہیں دف بجا رہا ہے قمر
کچھ اس مزے سے ترانے سنا رہے ہیں وہ

وہ کیف بار نگاہیں وہ چشمِ خواب آلوُد
جنونِ شوق کو کیا کیا جگا رہے ہیں وہ

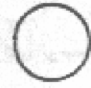
جہانِ عقل وخرد، کائناتِ سود وزیاں
بھلا چکا ہے کوئی یاد آ رہے ہیں وہ

مرے خیال کی رنگینیاں ہیں بزم افروز
کہ ہر خیال کو رنگیں بنا رہے ہیں وہ

نظر نظر میں خمستاں ادا ادا میں شراب
بڑھا و ساغر و مینا کہ آ رہے ہیں وہ

ذھین سوزِ محبت بھی سازِ حسن بھی ہے
کہ غم کدے میں مرے مسکرا رہے ہیں وہ

BZSTRFT



گریۂ صبح گاہ سے توبہ — ذوقِ فریاد و آہ سے توبہ

آگیا اپنے آپ پر ایماں — غیر کے اشتباہ سے توبہ

عشق رتبہ شناس ہے اپنا — طلبِ عزّ و جاہ سے توبہ

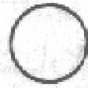
جب نظر ہی جمیل ہے اپنی — آرزوئے نگاہ سے توبہ

تھا تصوّر ترا گناہِ خیال — اس خیالِ گناہ سے توبہ

یہ گرفتاریٔ طلوع و غروب — عالمِ مہر و ماہ سے توبہ

عشق ہے نغمہ سنجِ اِلّا اللہ — معنیٔ لا اِلٰہ سے توبہ

نہیں ملتی اماں نظر کو ذہین
جلوۂ بے پناہ سے توبہ

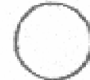


اک روز تو ملا کے نظر سے نظر تو دیکھ
اور میرے دل کے لوٹنے والے ادھر تو دیکھ

دائم رہیں، رہینِ تماشہ جنون و ہوش
ہے بے خبر تو دیکھ نہیں بے خبر تو دیکھ

اے ہم نشیں! علاجِ غمِ عشق ہو چکا
کیا دیکھتا ہے مجھ کو رُخِ چارہ گر تو دیکھ

ہے کم نگاہیوں سے تری آشنا ذہین
آخر ستم شعار کبھی بھول کر تو دیکھ



نہیں کہ جنّتِ عمرِ خضر نہیں ملتی
بہارِ عمرِ دوروزہ مگر نہیں ملتی

حقیقت اور مجاز ایک ہیں تو کیوں ظالم
ترے بیان سے تیری نظر نہیں ملتی

یہ دل سے دل نہ ملا بار بار وہ نہ ملے
یہ کیا ہوا کہ نظر سے نظر نہیں ملتی

جہاں بہائے نظر ہو وداعِ نظارہ
وہاں کسی کو نظر دیکھ کر نہیں ملتی

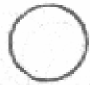
یہ کس کی زلف کے سائے میں پل رہا ہے جنوں
یہ کیوں خرد کو تری رہ گزر نہیں ملتی

تمہاری زلف ہے شاہد تمہارا رُخ ہے گواہ
کہیں کسی کو یہ شام و سحر نہیں ملتی

کہاں دوامِ مسرت، یہاں نصیبِ حیات
کہ ایک لمحہ خوشی عمر بھر نہیں ملتی

ذھین اب دلِ گم گشتہ کی تلاش نہ کر
جو چیز چھن گئی بارِ دگر نہیں ملتی

جے پور جنوری ۱۹۳۷ء



ہر راہ تری راہ گزر ہو کے رہے گی
دنیا مری دنیائے نظر ہو کے رہے گی

دل ہو کے رہے گی کہ جگر ہو کے رہے گی
کیا جانیئے کیا تیری نظر ہو کے رہے گی

آئینہ نگر آئینہ گر ہو کے رہے گی
ہر تازہ ادا تازہ نظر ہو کے رہے گی

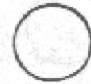
بیتابیٔ پیہم میں بھی ہے دل کو تسلّی
حالت جو اِدھر ہے وہ اُدھر ہو کے رہے گی

ہر دور گذرنے میں ہے روشن ہو کہ تاریک
جب شام ہوئی ہے تو سحر ہو کے رہے گی

خلوت کدۂ حُسنِ تصوّر کی حقیقت
کیا حُسنِ سرِ راہ گزر ہو کے رہے گی

کچھ لمحے ترے ساتھ بھی اے کاش گزرتے
یوں عمر بہر حال بسر ہو کے رہے گی

سنتا تھا ذھین آج وہی دیکھ رہا ہوں
کیا ایک خبر اور نظر ہو کے رہے گی



ہوا نہ یہ کہ ہو وہ خاکِ آستاں میری
تمام عمر تماشائی جہاں میری

دفا کہوں کہ حقیقت وہاں ملا تو ہی
تلاش جس نے محبت میں کی جہاں میری

ہزار طرح کہا تو ہزار طرح ہوئے
تمہارے حسن کا افسانہ داستاں میری

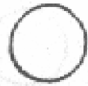
بیانِ حسن ہے حسنِ بیاں کے پردے میں
کہانیاں ہیں تمہاری کہانیاں میری

سمجھ رہا ہے دل اپنا ترے تبسم کو
میں جانتا ہوں کہ میری نہیں فغاں میری

حریمِ حسن وہاں کعبۂ جمال وہاں
جبینِ شوق جھکی ہے جہاں جہاں میری

ہے ایک جلوۂ آنی ازل سے تا بابد
وہ ایک آن ہوئی عمرِ جاوداں میری

بہر نشان وبہر نام جلوہ گر ہے ذہین
یہ ایک ہستیٔ بے نام و بے نشاں میری



پُر کیف ملاقاتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی
خاموشی میں باتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

یہ لیلیٰ سامانی کیوں ہے دل آئینہ ہے یا مجنوں ہے
کیا دیوانی راتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

دل پُر غم ہے آنکھیں پُرنم پھر مانگ رہا ہوں غم ہی غم
یہ میری مناجاتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

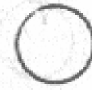
جب دل نے چاہا وہ آئیں وہ آ ہی گئے جو آ نہ سکیں
یہ دل کی کراماتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

وہ آئیں تو بھی چین نہیں وہ جائیں تو بھی چین نہیں
اس دل کی یہ باتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

دل تڑپے یا آنکھیں برسیں دونوں روئیں دونوں ترسیں
یہ سونی برساتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

دل اور نظر پہ ہر لحظہ جلووں کی نوازش کیا کہئے
یہ حسن کی سوغاتیں مجھ کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گی

جے پور، ۱۹۴۴ء



خود تمنائی تھے وہ میری تمنا ہی نہ تھی
میں تو جس دنیا میں تھا وہ میری دنیا ہی نہ تھی

دل کی ہر دھڑکن میں تھا اک سجدۂ بے اختیار
آپ کی نیچی نظر سجدہ پذیرا ہی نہ تھی

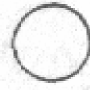
دیکھتا تھا قیس رفتارِ نظر کی ہر جہت
ورنہ ہر ذرّے میں لیلیٰ ہی تھی لیلیٰ ہی نہ تھی

تیری خلوت میں سبھی کچھ تھا مگر تیری قسم
ایک تیرے دیکھنے کو چشمِ بینا ہی نہ تھی

وہ تبسم ہی تبسم تھے تبسم کی قسم
کب تھی ایسی موج دریا میں کہ دریا ہی نہ تھی

اس ادا سے زندگی پھر زندگی بن کر رہی
وہ نظر جیسے کبھی ہم سے شناسا ہی نہ تھی

حسن نے جو چیز دل کو مرحمت کی اے ذہین
گھر کی قسمت بھی تھی کچھ تقدیرِ صحرا ہی نہ تھی



ترے آنے سے بھی تیری تمنا جا نہیں سکتی
محبت کامیابی کی حدوں میں آ نہیں سکتی

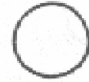
کسی کا التفاتِ ناز کیا ہے دل فریبی کیا
نہ چاہوں میں تو کوئی شے مجھے بہلا نہیں سکتی

جنوں ہی عشق کی گتھی کو سلجھائے تو سلجھائے
خرد الجھا تو سکتی ہے مگر سلجھا نہیں سکتی

وہ آنسو کیا جو دل کی آگ کو بھڑکا نہ سکتے ہوں
وہ ٹھنڈی سانس ہی کیا دل کو جو گرما نہیں سکتی

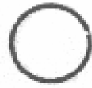
محبت کام کی شے ہے مگر کس کام کی شے ہے
یہ سب دنیا سمجھتی ہے مگر سمجھا نہیں سکتی

ذہین ان کو بھلانا خود فراموشی میں لازم ہے
نہ ہوں وہ یاد تو پھر یاد اپنی آ نہیں سکتی

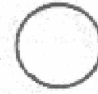


تمہیں بھی مری یاد آتی تو ہوگی — محبت تمہیں بھی ستاتی تو ہوگی
مجھے خواب میں تم نے دیکھا تو ہوگا — تمہیں بھی کبھی نیند آتی تو ہوگی
جہاں مسکراتے تھے تم چاندنی میں — وہاں چاندنی مسکراتی تو ہوگی
ستاروں سے نغمے برستے تو ہونگے — فضا سونی اب بھی گاتی تو ہوگی
طبیعت کی تسکین کے ہر سبب سے — طبیعت بھی تسکین پاتی تو ہوگی
تمہارا بھی کیا حال میرا سا ہوگا — محبت کہیں راس آتی تو ہوگی
کبھی دل کا چاہا بھی ہوتا تو ہوگا — کبھی دل کی حسرت بر آتی تو ہوگی
کسی چیز سے دل بہلتا تو ہوگا — کوئی شے طبیعت کو بھاتی تو ہوگی
وہ دنیا جو دنیا نے دیکھی نہیں ہے — وہ دنیا محبت دکھاتی تو ہوگی
کبھی دل کا کہنا بھی ہوتا تو ہوگا — محبت کبھی فتح پاتی تو ہوگی
یہ دُوری کے احساس کی سخت منزل — تصور کو آنکھیں دکھاتی تو ہوگی
جُدائی کے احساس کی ظلمتوں میں — کہیں شمع سی جھلملاتی تو ہوگی

جھپکتی تو ہونگی کبھی دل کی آنکھیں
ذہینؔ اُن سے بے التفاتی تو ہوگی



اے قیس نگاہِ شوق تری نامحرم ہے ناکامل ہے
تو لیلیٰ جس کو کہتا ہے وہ لیلیٰ کب ہے، محمل ہے
یہ جلوۂ حسن کی کثرت ہے، یا شدتِ عشق کی حیرت ہے
اس عالم میں یہ عالم ہے یہ منزل ہے وہ منزل ہے
ہر ذرہ اک آئینہ ہے ہر آئینہ حیرت کی دُنیا
یہ محفل کیا ہے خلوت ہے یہ خلوت کیا ہے محفل ہے
فرصت ہو اگر خود بینی سے تو اپنے آپ میں ڈھونڈ اُسے
تو اپنا آپ مسافر ہے تو آپ ہی اپنی منزل ہے
رقصِ بسمل دیکھا نہ گیا بسمل کی طرح وہ بھی تڑپا
جو بسمل ہے وہ قاتل ہے جو قاتل ہے وہ بسمل ہے
اس دریائے محبت میں جو ڈوب گیا وہ پار اُترا
ساحل میں ہے گرداب نہاں گرداب میں پنہاں ساحل ہے
اشعارِ ذہینؔ جو سنتے ہیں وہ آہ کریں یا واہ کریں
ان سازِ طرب کے نغموں میں کچھ سوزِ دل بھی شامل ہے

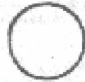


حریمِ آئینہ حیرت گہِ تماشا ہے
کہ برقِ حسن اسیرِ حجابِ بینا ہے

معاف اے نگہِ انتخابِ جانانہ!
کہ میرا عشق ترے حُسن کا تقاضا ہے

مری نگاہ رہینِ تعیّنات نہیں
بس اس حجاب سے ترکِ حجاب اولیٰ ہے

ذہین رہ گئیں آنکھیں مری کھلی کی کھلی
وہ بن سنور گئے آغوشِ آئینہ وا ہے

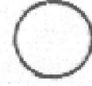


کیا خواب تھا خیال کا پہلو لئے ہوئے
دل مضطرب ہے آنکھ سے آنسو لئے ہوئے

زخمِ دل و جگر میں توازن ہے درد کا
تھا ناوکِ نگاہ ترازو لئے ہوئے

اب دل میں اپنے ذوقِ اسیری نہیں رہا
پھرتے رہیں وہ حلقۂ گیسو لئے ہوئے

کیوں حُسن کو ذہین بتاؤں میں نقشِ آب
آیا ہوں اُن کو ساتھ لبِ جو لئے ہوئے



دل آزار مجھی سے ہے دل آرام مجھی سے ہے
تو ہونے کو سب کچھ ہے تیرا نام مجھی سے ہے

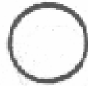
غیر کی دنیا سے مطلب غیر کے کاموں سے کیا کام
میری دنیا میں ہی ہوں میرا کام مجھی سے ہے

سرِ ازل کو مجھ میں دیکھ، رازِ ابد کو مجھ میں ڈھونڈ
ہر آغاز مجھی سے ہے ہر انجام مجھی سے ہے

ان کی صبح و شام سے کیا میری صبح و شام کو کام
میری صبح مجھی سے ہے میری شام مجھی سے ہے

حسن کی دولت دنیا میں تیرے کرم سے خاص سہی
لیکن عشق زمانے میں شاید عام مجھی سے ہے

میرے دیدہ و دل سے دیکھ ان کے زلف و رُخ کو ذھین!
سارا کفر مجھی سے ہے سب اسلام مجھی سے ہے



رازِ دنیا زِ عشق کا یہ دل امین ہے
ہر آسمان میری نظر میں زمین ہے

دیکھا نہ پیار سے تو یہ دیکھا نہ جائے گا
اے نازنین! دیکھ یہ دل نازنین ہے

آ دیکھ اپنے حسن کو میری نگاہ سے
تجھ سے زیادہ میری محبت حسین ہے

دیر و حرم پھریں تو پھریں تو نظر نہ پھیر
کافر تری نظر مجھے ایمان و دین ہے

ثابت ہے اے مجاز، حقیقت جمال کی
انکار ہے نگاہ کو دل کو یقین ہے

میں خوش ہوں خوش نصیبیٔ غم پر خوشا نصیب
آنسو ہیں میرے اور تری آستین ہے

ہوش و حواس خواب میں ہیں جاگ اے جنوں
دنیا کسی حسین کا خوابِ حسین ہے

کچھ بھی نہیں ہے تیرے سوا کائنات میں
تو جانِ کائنات ہے جانِ ذھین ہے



کمالِ ضبط بھی آدابِ بزمِ یار رہے
جو بے قرار یہاں ہو وہ برقرار رہے

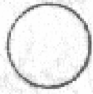
شعاعِ مہر ہو یا نورِ شمع ہو لیکن
تہِ مزار ہے جو کچھ سرِ مزار رہے

یہ التجا ہے مساواتِ حسن و اُلفت سے
جو بیقرار کرے وہ بھی بیقرار رہے

زوال ہو تو بقدرِ نمو ہو گلشن کو
خزاں خراب باندازۂ بہار رہے

رہے بہار سدا تو خزاں کہاں جائے
رہے خزاں جو ہمیشہ کہاں بہار رہے

ذہین جلوہ گہِ یار پاس آ پہنچی
نگاہ بس میں رہے دل پہ اختیار رہے



تم آؤ اور کسی کو یقین آ نہ سکے
حجابِ وہمِ جدائی ہمیں اٹھا نہ سکے

جہاں سے ہم نہ گئے جب تک آپ آ نہ سکے
وہ پردہ ہم نے اٹھایا جو تم اٹھا نہ سکے

یہ تھی ہلاکِ تبسّم کی آخری امّید
وہ مسکرائیں، مگر آہ مسکرا نہ سکے

وہ دے رہے ہیں اب الزامِ عشقِ رسوا کو
میں رازِ حسن تھا لیکن مجھے چھپا نہ سکے

اور اپنے پاس بھی دیکھا تو دور ہی سمجھا
مگر وہ دور نہیں تھے جو پاس آ نہ سکے

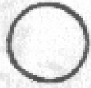
نہیں شریکِ گناہِ نگاہ میری نگاہ
وہ جلوہ ہے مری قسمت جو تم دکھا نہ سکے

وہ جانتے ہیں یہی جانتے رہے تا زیست
ہم اپنا قصۂ غم ان کو بھی سُنا نہ سکے

وہ ہر نگاہ تجلی وہ ہر قدم منزل
نظر بہک نہ سکی پاؤں ڈگمگا نہ سکے

ابھی ہے خام مگر ذوقِ خود فراموشی
جو دو جہان کو بھولے تمہیں بھلا نہ سکے

ذھین آ مری گم گشتگی کی قسمت دیکھ
وہ ڈھونڈتا ہے کبھی کوئی جس کو پا نہ سکے ۔



اُسے کیا امتیازِ ناقص و کامل نظر آئے
جسے ہر ذرہ تیرے حسن کا محمل نظر آئے

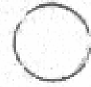
جو آنکھیں بند کر کے ڈوب جائے بحرِ اُلفت میں
وہ کیا گرداب جانے کیا اسے ساحل نظر آئے

یہ گردابِ فنا ہے ہم جسے ساحل سمجھتے ہیں
اگر ہم ڈوب جائیں تو ہمیں ساحل نظر آئے

نگاہِ شوق بے آدابِ حُسنِ یار سے واقف
نہیں تو ذرہ ذرہ حُسن کا محمل نظر آئے

جبینِ اہلِ دل بیتابِ سجدہ کیوں نہ ہو جائے
ترے کوچے کا ہر ذرہ انھیں جب دل نظر آئے

ذھین اس رمزِ مستی کے ہیں شاہد ہوش والے بھی
کمالِ ہوشیاری ہے کہ ہم غافل نظر آئے



کمال، جلوۂ جاناں دکھا رہا ہے مجھے
چھپا ہوا ہے جو مجھ میں چھپا رہا ہے مجھے

قدم قدم پہ وہ منزل بنا رہا ہے مجھے
میں اس کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ پا رہا ہے مجھے

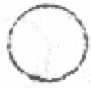
جلالِ عشق انھیں کو دکھا رہا ہے انھیں
جمالِ حسن مجھی کو دکھا رہا ہے مجھے

یہ میرا حسنِ طلب، حسن کی طلب ہی نہ ہو،
میں جا رہا ہوں کہ وہ خود بلا رہا ہے مجھے

وہ آ رہے ہیں مگر یہ سمجھ نہیں سکتے،
خود آ رہے ہیں کہ کوئی بلا رہا ہے مجھے

وہ جس کی یاد میں سب کچھ بھلا چکا ہوں میں
زہے نصیب محبت بھلا رہا ہے مجھے

ذہینؔ عشق نے جس کو خدا بنایا ہے
زہے کرم کہ وہ بندہ بنا رہا ہے مجھے



کمالِ حسن کا عالم دکھا دیا تو نے
ہر ایک چیز کو خود سا بنا دیا تو نے

وہیں ہے طور جہاں پڑ گئی نظر تیری
وہیں چمن ہے جہاں مسکرا دیا تو نے

حضور و غیب ہیں جلوہ گری ہی جلوہ گری
جہانِ دید و دل جگمگا دیا تو نے

حقیقت اپنی سمو کر جمالِ صورت میں
جو دیکھنے میں نہ آئے دکھا دیا تو نے

دفا کہوں کہ حقیقت، وہاں ملا میں ہی
جہاں کسی کو کچھ اپنا پتا دیا تو نے

وہ بے چراغ سا اجڑا ہوا سا بت خانہ
وہ دل کہ جس کو نظر سے گرا دیا تو نے

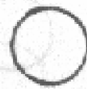
زہے نصیب محبت حیاتِ غم بن کر
غمِ حیات گوارا بنا دیا تو نے

محبت اب بھی محبت ہے حسن اب بھی حسن
ترا کرم ہے کہ پردہ اٹھا دیا تو نے

تری نگاہ میں اب دیکھتا ہوں اپنا مقام
مری نظر میں مجھے کیا بنا دیا تو نے

بقیدِ ہوش مذاقِ جنوں عطا کر کے
نظر سے دل کی حدوں کو ملا دیا تو نے

نہ خود شناس نہ خود آشنا نہ خود آگاہ
مگر ذہینؔ کو بے خود بنا دیا تو نے



جو چیز ڈھونڈتا تھا وہی مل گئی مجھے
تم کیا ملے جہان سے فرصت ملی مجھے

خود سے بھی بے نیاز تھی میری خودی مجھے
میں تھا مگر کچھ اپنی ضرورت نہ تھی مجھے

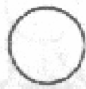
اس سے زیادہ آپ سے واقف نہیں ہوں میں
جتنی ہے اپنے آپ سے خود آگہی مجھے

اس باغ میں مآل سے غفلت بہار ہے
جب پھول ہنس رہے ہوں نہ آئے ہنسی مجھے

تو ہے تو کیا نہ ہوگا تری بزمِ ناز میں
محسوس ہو رہی ہے خود اپنی کمی مجھے

انفاسِ دوست دیں نہ سہارا تو اے ذہین
دشوار مرحلہ ہے دمِ آخری مجھے

(کراچی-۱۹۵۳ء)



ہر ذرہ اب ہے جلوہ گہِ یار دیکھیے
آئینہ ہو گئے در و دیوار دیکھیے

دنیا ہے کیفِ حسن میں سرشار دیکھیے
کافر جو دیکھنا ہو تو دیندار دیکھیے

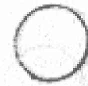
الجھی ہوئی ہے قیدِ تماشا میں جو نظر
وہ ہو گئی نقابِ رخِ یار دیکھیے

یہ انتہائے قرب ہوا انتہا کے بعد
کچھ دور ہو تو جلوہ گہِ یار دیکھیے

دیکھا ہوا ہے جلوۂ نادیدہ بھی مرا
میری نگاہِ شوق کا معیار دیکھیے

ہے جلوہ ہائے خاص کا پردہ نگاہِ عام
خلوت میں جو نہیں سرِ بازار دیکھیے

مستی میں غرق ہوش کی باتیں گواہ ہیں
ہے بے خودی ذہین کی خوددار دیکھیے



بزمِ نظر میں ذوقِ تماشا لئے ہوئے
آیا ہے مجھ کو حُسنِ خود آرا لئے ہوئے

برپا ہے حشرِ جلوہ گری ہر طرف، مگر
عجزِ نظر کا میکر سہارا لئے ہوئے

پھر کاروانِ حسن ہے مصرِ نگاہ میں
بیداریوں میں خوابِ زلیخا لئے ہوئے

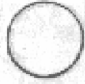
ذرے ہیں نازِ وسعتِ صحرا سے بہرہ یاب
قطرے ہیں اپنی گود میں دریا لئے ہوئے

وارفتگئ دل ہے امانت کہ اہلِ دل،
بیٹھے رہیں گئی ہوئی دنیا لئے ہوئے

یہ راہ کون سی ہے کہ آسودہ ہے جہاں
منزل بغل میں نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

تجھ سا کوئی نہیں ہے تو یہ تیرے سامنے
اترا رہا ہے آئینہ پھر کیا لئے ہوئے

دیکھا نہ اہلِ حشر کی آنکھوں نے اے ذہین
ہم دل میں تھے وہ حشرِ تمنا لئے ہوئے



ہوں میں ہی پردہ میری نظر ہی نقاب ہے
تو ورنہ سو حجاب میں بھی بے حجاب ہے

تیری نگاہ سے تجھے دیکھا کریں گے ہم
تعبیر اپنی دید کی نادیدہ خواب ہے

لازم ہے حُسن کے لئے تمکین وناز بھی
ورنہ ترا سکون مرا اضطراب ہے

جانچا جو موتیوں کو تو آنسو نظر پڑے
دیکھا جو غور سے تو سکوں اضطراب ہے

حد سے گذر گیا ہے جنونِ نگاہِ شوق
ہر ذرہ آج حسن میں تیرا جواب ہے

اے دوست! تیرے جلوۂ بے دید کے نثار
محرومِ چشمِ شوق ہے، دل کامیاب ہے

دلیوار و در کو ان کے تصور میں پوچھنا

کیا یہ بھی اے نگاہِ محبت! ثواب ہے

سجدے بچھا رہے ہیں ہر اک رہگزر میں ہم
محوِ خرامِ ناز وہ مستِ شباب ہے

مانا کہ انتخاب ہے تو کائنات میں
دل کو یہ ناز ہے کہ ترا انتخاب ہے

لازم ہے حسن کے لئے تمکین و ناز بھی
ورنہ ترا سکون مرا اضطراب ہے

میں بھی کسی کی موجِ تبسم ہوں اے ذہین
دنیا مری نگاہ میں رقصِ حباب ہے

(وزیرپور دریاست جے پور) ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء



دل میں حسینِ الفت کیا گیت گا رہی ہے
بیگانۂ تلفّظ آواز آ رہی ہے

تاریک رات دل میں بربط بجا رہی ہے
خاموشیوں سے کس کی آواز آ رہی ہے

یہ عالمِ جوانی، عالم کی ہے جوانی
چھائی ہوئی یہ مستی دنیا پہ چھا رہی ہے

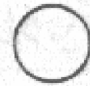
جادو بھری نگاہیں افسانۂ فسوں ہیں
اے شوخیٔ تبسم! بس نیند آ رہی ہے

اللہ خیر دل کی، اس غم نصیب دل کی
تصویر ان کی دل میں پھر مسکرا رہی ہے

چشمِ کرم کو دل پر ایمان آ چلا تھا
کافر، تری نظر پھر کافر بنا رہی ہے

جانِ ذہین میرے ظلمت کدہ میں کیا ہے
تو ہے تو دل کی دنیا سب جگمگا رہی ہے

(وزیرپور — ۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء)



آئے وہ اور بے نقاب آئے
جیسے ہر چیز پر شباب آئے

دل کی آنکھیں کھلیں کہ نیند آئی
کیسے کیسے حسین خواب آئے

ایک ہونا وہ دیدۂ و دل کا
جیسے بیداریوں میں خواب آئے

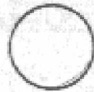
ہم نے تیری نظر میں دیکھے ہیں
جتنے دنیا میں انقلاب آئے

سب تری بزم سے خراب گئے
ہم تری بزم میں خراب آئے

وہ جدھر جھومتے چلے آئیں
خود برستی ہوئی شراب آئے

طالبِ رنگ و بو تھے دیدۂ و دل
تیری محفل سے کامیاب آئے

ایک ذرے کو دیکھنے میں ذہین
سامنے لاکھ آفتاب آئے



جب کبھی وہ بے نقاب ہوتا ہے
ہر سکوں اضطراب ہوتا ہے

جلوہ فرمائیاں ارے ایسے میں
خواب میں ختم خواب ہوتا ہے

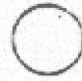
حسن انگڑائی لے کے جاگ اٹھا
رونما انقلاب ہوتا ہے

کون دیتا ہے دادِ جلوہ گری
عشق کا انتخاب ہوتا ہے

ہائے وہ سائیں سائیں راتیں جب
سانس لینا عذاب ہوتا ہے

دیکھتا ہوں میں آپ کی جانب
جب کوئی انقلاب ہوتا ہے

نگہِ عشق ہے نقاب ذہین
حسن زیرِ نقاب ہوتا ہے



نگاہِ شوق منظورِ نگاہِ یار ہو جائے
تو حسن و عشق کا پھر ایک ہی معیار ہو جائے

اگر کیفِ تجلّی سے نظر سرشار ہو جائے
میں جس جلوے سے کہہ دوں جلوہ گاہِ یار ہو جائے

ہوائیں مست ہو جائیں فضا سرشار ہو جائے
وہ آئیں تو جہاں گلزار ہی گلزار ہو جائے

سمٹ آئیں اگر رنگینیاں سارے زمانے کی
تو ان رنگینیوں کا نام حُسنِ یار ہو جائے

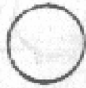
یہ اے ذوقِ نظر بیتابیٔ دل کی ہے صند ورنہ
وہ آئیں سامنے تو دیکھنا دشوار ہو جائے

وہاں سمجھا ہے جا کر دل نے مفہومِ محبت کو
سمجھنا اور سمجھانا جہاں بیکار ہو جائے

محبت کا سمندر، دل کی کشتی، شوق کا طوفاں
خدا ہی ہے جو ایسے میں بھی بیڑا پار ہو جائے

ذھین آخر نیازِ عشق پر بھی ناز ہے ہم کو
جہاں ہم سر جھکا دیں آستانِ یار ہو جائے

(آل انڈیا مشاعرہ، جے پور)



صورت کوئی جز صورتِ جانانہ کہاں ہے
کعبہ ہے حقیقت میں صنم خانہ کہاں ہے

یہ انجمنِ حسن ہے مے خانہ کہاں ہے
جز دیدہ و دل شیشہ و پیمانہ کہاں ہے

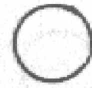
ہاں تکملۂ ذوقِ بر افگندہ نقابی
اس بزم میں سب اپنے ہیں بیگانہ کہاں ہے

بیتاب نظر کے لئے بیتاب ہیں جلوے
خود حسن ہے دیوانہ کہ دیوانہ کہاں ہے

تیری نگہِ ناز بتائے تو بتائے
میں آج کہاں ہوں مرا افسانہ کہاں ہے

دے سوزِ فنا عشق کو اے شمعِ تجلّی
پروانہ سہی ہمّتِ پروانہ کہاں ہے

ہو خیر ذھین آپ کے دم اور قدم کی
ویرانہ ہے آباد تو ویرانہ کہاں ہے



میں تیرے روبرو ہوں، تو میرے روبرو ہے
میں ہوں تری نظر میں، میری نظر میں تو ہے

میں تجھ کو ڈھونڈتا ہوں یا آپ کھو گیا ہوں
یہ اپنی جستجو ہے یا تیری جستجو ہے

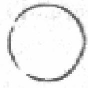
یہ ہے کمالِ الفت یا ہے کمالِ نسبت
جو میری آرزو ہے وہ تیری آرزو ہے

منصُور اور مجھ میں کچھ فرق ہے تو اتنا
وہ کہہ اٹھا کہ میں ہوں، کہتا ہوں میں کہ تو ہے

میں غایتِ عدم ہوں اور تو ہے عینِ ہستی
جب میں نہیں تو کیونکر تجھ کو کہوں کہ تو ہے

آبادِ حُسنِ مانی، بربادِ حُسن ہو کر
دیکھو مری نظر میں دنیا مقام ہو ہے

ناگفتہ حالِ دل بھی ان تک ذہین پہنچا
یہ خامشی بھی اپنا اندازِ گفتگو ہے



جب نظر سے نظر ملالیں گے
وہ ہمیں آئینہ بنالیں گے

شرط ہے ایک میرا اٹھ جانا
وہ حجابات خود اٹھالیں گے

یہ بھی اک ذوقِ نامکمل ہے
ہم تری جستجو میں کیا لیں گے

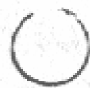
پیکرِ عشق کم حسین نہیں
دیکھنا وہ گلے لگالیں گے

میری سوتی ہوئی امنگوں کو
اک تبسم میں وہ جگالیں گے

میں تو ہوں اپنی ذات کا طالب
اور ہوں گے جو ماسوا لیں گے

کیجیے فرض بے نقاب ہیں آپ
پھر بھی کیا ہم نظر اٹھالیں گے

(جے پور۔ مئی ۱۹۳۰ء)



وہ ہم کو نظر کیوں آنے لگے دھوکا ہے نظر کا دھوکا ہے
ہم علم و خبر کہتے ہیں جسے وہ علم و خبر کا دھوکا ہے

کیا دل کی دنیا میں آکر دنیا ہی بدل ڈالی تم نے
گھر پر ہے گماں ویرانے کا ویرانے پہ گھر کا دھوکا ہے

یہ میرے غم کی خوش فہمی، یہ میرے شوق کی سادہ دلی
تم نے مجھے ہنس کر کیا دیکھا آہوں میں اثر کا دھوکا ہے

ہو سکتا ہو تو پار نہ ہو اس بحرِ غم کی موجوں سے
دو بوندیں خاک ڈبوئیں گی یہ دیدۂ تر کا دھوکا ہے

یہ خاکِ قدم چھونے کا اثر دیکھو کہ ذہینِ خاک بسر
ذرّے جو لگے ہیں ماتھے پر تو شمس و قمر کا دھوکا ہے



جلوہ نظر میں ہے تو نظر جلوہ گاہ ہے
ورنہ یہاں نگاہ قصورِ نگاہ ہے

ممنوع ضبط، قابلِ تعزیر آہ ہے
شاید کہ عشق جرم محبت گناہ ہے

آکر فضائے عالمِ مستی میں دیکھیے
دُنیا گناہِ ہوش ہے ہوش گناہ ہے

آئی نظر مجھے تو جہاں تک نظر گئی
برقِ جمالِ یار بقدرِ نگاہ ہے

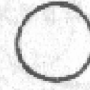
اب لطفِ آہ و لذتِ گریہ کہاں نصیب
لب پر ہنسی نہیں ہے یہ مانا کہ آہ ہے

میری امید نکلی نہ جو تیرے لب سے بات
میرا نصیب جو تری نیچی نگاہ ہے

ہے اعتماد رحمتِ پروردگار پر
ہم سے اگر گناہ نہ ہو تو گناہ ہے

ہے برقِ نازِ حسن، فروغِ نیازِ عشق
یعنی جو میرا دل ہے وہ تیری نگہ ہے

پہلو میں دل ہے دل میں نہاں دردِ ذہین
اس درد میں نگاہِ محبت پناہ ہے



وہ ہم کو نظر کیوں آنے لگے دھوکا ہے نظر کا دھوکا ہے
ہم علم و خبر کہتے ہیں جسے وہ علم و خبر کا دھوکا ہے

کیا دل کی دنیا میں آکر دُنیا ہی بدل ڈالی تم نے
گھر پر ہے گماں ویرانے کا ویرانے پہ گھر کا دھوکا ہے

یہ میرے غم کی خوش فہمی، یہ میرے شوق کی سادہ دلی
تم نے مجھے ہنس کر کیا دیکھا آہوں میں اثر کا دھوکا ہے

ہو سکتا ہو تو پار نہ ہو اس بحرِ غم کی موجوں سے
دو بوندیں خاک ڈبوئیں گی یہ دیدۂ تر کا دھوکا ہے

یہ خاکِ قدم چھونے کا اثر دیکھو کہ ذہینِ خاک بسر
ذرّے جو لگے ہیں ملتے پر تو شمس و قمر کا دھوکا ہے

جے پور ۱۹۳۵ء

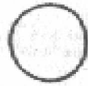
۱۹۲۴ء

سے

۱۹۱۵ء

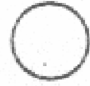
تک

نقشِ دوامِ صفحۂ ہستی ہے نامِ دوست
دُنیائے کیف و عالمِ مستی ہے نامِ دوست



اے خاکدانِ دہر کے ذرّو! خبر بھی ہے — میرا نشانِ قبر مٹا بھی تو کیا ہوا
ترکِ ستم پہ ہو کے پشیمان رہ گئے — آیا اگر خیالِ وفا بھی تو کیا ہوا
یارب! بُرا ہو گریۂ بے اختیار کا — ہم نے ہزار ضبط کیا بھی تو کیا ہوا
میں غور کر رہا ہوں طلسمِ وجود پر — ہست و عدم میں فرق ہوا بھی تو کیا ہوا
کیا کثرتِ جمال حجابِ نظر نہ تھی — میں تیری بزمِ ناز میں تھا بھی تو کیا ہوا
دل ہے حریفِ ذوقِ طلب مجھ سے پوچھیے — دیکھا کسی کو آبلہ پا بھی تو کیا ہوا
سمجھی نگاہِ یاس کی جس نے نہ التجا — اُس سے ہزار بار کہا بھی تو کیا ہوا

آخر ذھین عشق تو کام اپنا کر گیا
ہوتی رہی دعا بھی دوا بھی تو کیا ہوا



قیامت تھا کہ رازِ التفات افسانہ ہو جانا
ترا کچھ منہ سے کہنا اور مرا دیوانہ ہو جانا

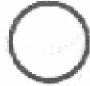
مرا ہونا ہوا خاکِ درِ میخانہ ہو جانا
نہ ہونا ہم نصیبِ گردشِ پیمانہ ہو جانا

خدا رکھے یہ کیفیات ہیں اور اختیاری ہیں
کبھی ہشیار ہو جانا، کبھی دیوانہ ہو جانا

اگر تعمیرِ کفر و دیں حقیقت میں بھی دو شے ہیں
ذرا معمارِ کعبہ، بانیٔ بت خانہ ہو جانا

مرے شوقِ نظر میں زندگی جس سے عبارت تھی
مقدر تھا ہلاکِ جلوۂ جانانہ ہو جانا

یہ کہنا ہے تو کہیئے آپ اپنی مست آنکھوں سے
بہت ممکن ہے مجھ سے لغزشِ مستانہ ہو جانا



سرِ بزم اب وہ مجبورِ وفا ہیں کیا کہوں تجھ سے
تڑپنا اور تڑپ کر جذب بیتابانہ ہو جانا

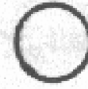
نہیں یہ وسعتِ تاثیرِ دردِ دل تو پھر کیا ہے
مری ہر بات سے تیار اک افسانہ ہو جانا

حجابِ امتیاز اسم ہے اپنی نگاہوں پر
نہیں تو شمع ہو جانا کبھی ہے پروانہ ہو جانا

یہ کس نے کثرتِ تکوین کی قسمت میں لکھا تھا
ہماری وحدتِ تخئیل سے ویرانہ ہو جانا

کوئی اس رہزنِ تمکین و ضبطِ عشق سے کہہ دے
مری رسوائیوں سے تو کہیں رسوا نہ ہو جانا

غمِ جاناں ذہین اپنا لیا اچھا کیا ورنہ
غمِ کونین سے دشوار تھا بیگانہ ہو جانا



ایک دل اور دل میں لاکھ صفات
ہر صفت میں عیاں کرشمۂ ذات

کوئی حاجت روا نہیں ہوتی
پھر بھی ہیں آپ قبلۂ حاجات

مرتے مرتے نہ توبہ کرنی تھی
ہو گیا خونِ آرزوئے نجات

تم نے افسانہ کر دیا ناحق
زندگی اور موت تھیں اک بات

ہر نظر میں ہیں سینکڑوں انوار
آپ ہیں پیکرِ تجلیات

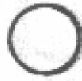
اب تو یکساں ہے اے دلِ آگاہ
عیش کی صبح ہو کہ غم کی رات

رقص میں ہے جہانِ حسن و شباب
اے مری انجمن تری کیا بات

موت کے ڈھول گور کے نغمے
زندگی کی نکل رہی برات

دل پہ چھائی ہوئی گھٹا ہے ذھین
لے نہ ڈوبے یہ آنکھوں کی برسات

سیکر (ریاست جے پور) ۱۹۳۶ء



کیا غرض کچھ بھی کہیں مجھ کو مسلماں دیکھ کر
دیکھتا ہوں روئے جاناں سوئے قرآں دیکھ کر

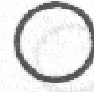
ہم نشیں لے چل سوئے گلشن مگر ہاں دیکھ کر
ہم نرالے گل کھلائیں گے گلستاں دیکھ کر

ایک پیغامِ خزاں ہے آمدِ فصلِ بہار
بابِ عبرت کھل گیا مجھ پر گلستاں دیکھ کر

میں حسینوں کو پریشاں دیکھ سکتا ہی نہیں
چیخ اٹھتا ہوں گلوں کو چاک داماں دیکھ کر

موت سے بھی ہو گیا مایوس ناکامِ حیات
درد میں آرام کی صورت نمایاں دیکھ کر

کہہ گئے پہلی نظر میں وہ ہمیں سب کچھ ذھین
پڑھ لیا افسانہ ہم نے صرفِ عنواں دیکھ کر



نظر فریب نہیں اب وہ جلوہ ہائے نظر
کہ میری آنکھ نہیں لذتِ آشنائے نظر

نویدِ ذوق ہے ہر صاحبِ نظر کے لئے
سجودِ سر سے بھی اعلیٰ ہیں سجدہ ہائے نظر

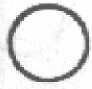
نگاہِ یاس پہ فرمایئے نگاہِ کرم
نہ کیجیے نظر انداز مدعائے نظر

وہ سُکر و خمر کی بارش وہ کیف بار سرور
شبابِ کوثرِ مستی ہے آبنائے نظر

وہ نورِ چشمِ جہاں، یوں نظر سے غائب ہے
کہ جیسے آنکھ میں رہ کر نظر نہ آئے نظر

مجھے ذہین نگاہوں سے حال کہنے دو
نظر شناس سمجھتا ہے التجائے نظر

مطبوعہ: نگار، ۱۹۳۷ء



تلاشِ حق ہے باندازِ جستجوئے مجاز
ہم آرزوئے حقیقت ہے آرزوئے مجاز

کہاں سے عالمِ بے رنگ و بو میں جا پہنچا
فریب خوردۂ دنیائے رنگ و بوئے مجاز

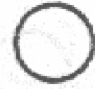
مگر بیانِ حقیقت مجاز ہوتا ہے
بہشت میں نظر آتے ہیں کاخ و کوئے مجاز

بہارِ جاں سے ہے دنیائے آب و گل کی بہار
نہیں تو خاک میں مل جائے آبروئے مجاز

یہاں جو عینِ حقیقت مجاز میں ہے وہ دیکھ
نہیں تو ایک نظر بھی نہ دیکھ سوئے مجاز

یہاں ہے نسبتِ ساقی سے معتبر مستی
شرابِ کوثر و تسنیم آب جوئے مجاز

جمالِ حسنِ حقیقی نظر میں ہو تو ذہین
فروغِ سینۂ سینا ہے لالہ روئے مجاز



تغافل کے ترے صدمے سہوں کبھی تو سہوں کب تک
نگاہِ نازِ جاناں ! میری امیدوں کا خوں کب تک

ترا پردہ ہے میرا ہوش یوں خاموش ہوں اب تک
نہیں تو جلوہ گر تو ہے کہ میں بے ہوش ہوں اب تک

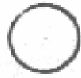
مجھے بھی رخصتِ یک آہ اے گلچیں ! کہ آتی ہے
نوائے ہمصفیرانِ چمن ! میں چپ رہوں کب تک

جو باتیں دل میں رہنی چاہئیں وہ لب پہ کیوں آئیں
میں اپنے دل میں ہوں منصور اور خاموش ہوں اب تک

وہ طولِ داستانِ غم سے گھبرا کر یہ کہتے ہیں
سنے جائے کوئی آخر حکایاتِ جنوں کب تک

نکلنے کو ہے جانِ زار جانِ انتظار آجا
تصور میں در و دیوار کو سجدے کروں کب تک

ذہین اک روز قیس و کوہکن کا راز کھلنا ہے
فسانے اپنے میں اوروں کے ناموں سے سنوں کب تک



بندگی رہ گئی محدود فنا ہونے تک
یعنی بندہ نہ رہوں گا میں خدا ہونے تک

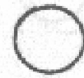
آہ کو صبر کی تعلیم رسا ہونے تک
درد کو ضبط کی تلقین دوا ہونے تک

چشمِ نم، قلبِ تپاں، شدتِ غم، جوشِ طلب
تھے یہ سب ظرفِ دعا حرفِ دعا ہونے تک

گرمیٔ جذبِ جنوں، سوزِ دروں، نالۂ خوں
ہم کہاں ہوں گے ان آہوں کے رسا ہونے تک

رفتہ رفتہ خلشِ غم بھی مساوات ہوئی
یہ بلا بھی تھی گرفتارِ بلا ہونے تک

غمِ کونین بھلایا نہ گیا مجھ سے ذہین
دستِ ساقی سے مجھے جام عطا ہونے تک



جستجو کے یہی معنیٰ ہیں کہ کھو جائیں ہم
مقصدِ زیست یہی ہے کہ تجھے پائیں ہم

یہ تمنا ہے کہ اے حُسنِ تمنّا آزار!
داغ جو تو نے دیئے ہیں کبھی دکھلائیں ہم

کوئے جاناں کے سوا اور ٹھکانہ ہے کہاں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جاؤ تو کہاں جائیں ہم

آج تم اپنی جفاؤں پہ جو شرماتے ہو
آہ کیا اپنی وفاؤں پہ کبھی شرمائیں ہم

یہ بھی جینا کوئی جینا ہے کہ تم پہ نہ مٹے
ایسے جینے سے تو بہتر ہے کہ مرجائیں ہم

عالمِ بے خبری کا ہے یہ عالم تو ذہین
کیا ہو کیا جانے اگر ہوش میں آجائیں ہم



گو شوقِ طلب سب کے دل میں ہے لیکن کامل ایک نہیں
گم کردۂ منزل لاکھوں ہیں گم گشتۂ منزل ایک نہیں

جز نام وجودِ غیر کہاں جز وہم نمود و نام کہاں؟
تصویریں حیرتِ محفل ہیں اب اہلِ محفل ایک نہیں

ہر قطرے میں اک دریا ہے ہر دریا میں اک قطرہ ہے
جب ایک سے واصل ایک ہوا کیوں ایک سے واصل ایک نہیں

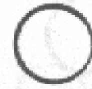
تا ذرے میرے وجود کے ہیں ہر ذرہ اک آئینہ ہے
تا نقش ہیں ہر آئینے میں اور ان میں باطل ایک نہیں

تو جلوۂ وحدت میں بھی ہے اور انجمنِ کثرت میں بھی
کیا شانِ ظہور و خفا دو ہیں کیا خلوت و محفل ایک نہیں

جو لطفِ سکونِ ساحل ہے گردابِ فنا کو حاصل ہے
کیوں اپنی نظر میں ہم سفرو! طغیانی و ساحل ایک نہیں

یہ مانا عینِ مقصد ہے بیگانۂ مقصد ہو جانا
ہر ذرہ حاملِ لیلیٰ ہے، اے مجنوں! محمل ایک نہیں

نظارۂ حُسن ذہین کہیں پردوں میں الجھ کر رہتا ہے
مانا کہ ہزاروں پردے ہیں کیا کیجئے حائل ایک نہیں



جس دن سے تجھے پیشِ نظر دیکھ رہے ہیں
حیرت سے ہیں شمس و قمر دیکھ رہے ہیں

نیرنگِ تماشائے نظر دیکھ رہے ہیں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں

آکر وہ گئے اور ابھی منتظرِ دید
حسرت سے سوئے راہگزر دیکھ رہے ہیں

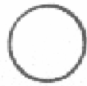
کیا گردشِ ایام ہے کیا گردشِ تقدیر
دکھلاتی ہے جو تیری نظر دیکھ رہے ہیں

گو ایک ہی جلوہ ہے مگر دیکھنے والے
ہر لحظہ باندازِ دگر دیکھ رہے ہیں

محفل تھی کہ حیرت گہِ چشمِ غلط انداز
ہر ایک یہ سمجھا کہ ادھر دیکھ رہے ہیں

داناؤں کو کیا کام بھلا سود و زیاں سے
دیوانے ہیں جو نفع و ضرر دیکھ رہے ہیں

اپنا تو ذھین اور ہی معیارِ نظر ہے
ہم عیب میں بھی شانِ ہنر دیکھ رہے ہیں



خلوتِ حسن و عشق ہے غیر یہاں سمائے کیوں
میرا خیال ہی سہی وصل میں لیکن آئے کیوں

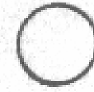
بندِ اجل کو توڑ دے بے خودیِ مدام سے
ہوش کی ہو جسے طلب ہوش میں پھر وہ آئے کیوں

بزم فروزِ قلب ہی، سوزِ دروں نہیں، تو پھر
شمع کی طرح بزم میں کوئی ہمیں جلائے کیوں

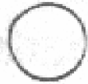
قرب، خیالِ متصل ؛ بعد، خیالِ منفصل
عالمِ وصل و فصل میں جائے تو کوئی جائے کیوں

آئینہ، اک مقام ہے فطرتِ عکسِ حسن کا
اپنی مثال آپ ہی کوئی مگر بنائے کیوں

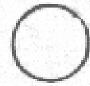
دل ہے ذھین آستاں ہم درِ دل کے پاسباں
اپنے ہی دل میں آدمی اذن بغیر آئے کیوں



جو کچھ میں جانتا ہوں وہ مانتا نہیں ہوں
تم اپنے منہ سے کہہ دو میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں
برباد کیوں ہوا ہوں کیا جانتا نہیں ہوں
ناآشنا سے اپنے ناآشنا نہیں ہوں
یکتائیِ نظر کا حُسنِ فریب دیکھو!
آئینہ روبرو ہے اور دیکھتا نہیں ہوں
وہ ہیں کہ اس ادا سے جلوے دکھا رہے ہیں
میں ہوں کہ اپنی صورت پہچانتا نہیں ہوں
ہم وہ ذھین دونوں اب ایک ہو گئے ہیں
وہ دوسرے نہیں ہیں میں دوسرا نہیں ہوں



مجھ سا فریب خوردۂ مہر و وفا نہیں
میری نظر میں تیری جفا بھی جفا نہیں
محویتِ جمال ہے آغوشِ بے خودی
میں دیکھتا ہوں تجھ کو مگر دیکھتا نہیں
جز آرزوئے دوست نہیں مدعا اگر
جز آرزوئے موت کوئی مدعا نہیں
ہر صورتِ حجاب میں ہے شوخیِ نمود
ہے کون سی ادا کہ حریفِ حیا نہیں
تھا میں ہی میں ذھین کبھی ان کی بزم میں
اب وہ ہی وہ ہیں اور کوئی دوسرا نہیں



حسن کی حقیقت ہوں عشق کا تقاضا ہوں
میں نگاہِ مجنوں ہوں میں جمالِ لیلےٰ ہوں

میری تابشوں میں گم میری زندگانی ہے
برقِ بے تکلف ہوں سوزِ بے محابا ہوں

سو جہانِ رنگ و بو میرے ہر نفس میں ہیں
صد وداعِ ساغر ہوں صد شکستِ مینا ہوں

میرا ذوقِ رندانہ ہے خدائے میخانہ
میں نشاطِ مستی ہوں میں سرورِ صہبا ہوں

اپنے حال میں خوش ہوں ہر خیال میں خوش ہوں
میں خود اپنا عالم ہوں میں خود اپنی دنیا ہوں

آگئیں محبت میں کچھ جنوں کی شانیں بھی
خود ہی باتیں کرتا ہوں خود ہی چونک اٹھتا ہوں

فرصتِ تماشائے دو جہاں ہے ناممکن
اے ذھین تو خود کو دیکھ لے کہ میں کیا ہوں



تم دل کے حق میں دشمن ہو یا دوست اسے ہم کیا سمجھیں
یہ زخم حقیقت میں دل کے ہیں زخم کہ مرہم کیا سمجھیں

یہ ان کی نظر کے شعبدے ہیں یا اپنی نظر کے دھوکے ہیں
ہم نغمۂ شادی کیا جانیں ہم نالۂ ماتم کیا سمجھیں

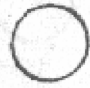
آشفتہ مزاجوں سے مطلب کیا دنیا کے بے دردوں کو
جمعیتِ گیسو کے معنیٰ بے خاطرِ برہم کیا سمجھیں

اے عشق ہوس اور شوق کا ہے معیار ترا اول آخر
آرامِ مؤخر کو تیرے آلامِ مقدم کیا سمجھیں

اندوہ زبانِ عشق میں ہم کہتے ہیں مسرت کو لیکن
جو اہلِ کتابِ عشق نہیں وہ فلسفۂ غم کیا سمجھیں

احساسِ بقا و علمِ فنا یہ دونوں ہرگز ایک نہیں
اس عالمِ ہستی میں رہ کر ہم ہستیٔ عالم کیا سمجھیں

ہم کچھ بھی ذھین کہے جائیں یہ کہنے میں کوئی کہتا ہے
آیاتِ صریح نہ دیکھتے ہوں وہ معنیٔ مبہم کیا سمجھیں



وہ خود اپنی جفاؤں پر پشیماں ہوتے جاتے ہیں
ہمارے داغ ہائے دل نمایاں ہوتے جاتے ہیں

حجاب وجلوہ دونوں جزوِ ایماں ہوتے جاتے ہیں
تمہارے عشق میں کافر مسلماں ہوتے جاتے ہیں

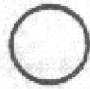
یہ پروانوں کے ماتم میں الٰہی ؛ شمعِ سوزاں ہے
کہ پروانے نثارِ شمعِ سوزاں ہوتے جاتے ہیں

تجلی پردہ دارِ حسن بھی ہے پردہ در بھی ہے
وہ جتنے چھپتے جاتے ہیں نمایاں ہوتے جاتے ہیں

دعائے دوستاں ہو یا دوائے چارہ گر، کیا ہے
مرے جینے کے اپنے آپ ساماں ہوتے جاتے ہیں

نہ لے منت جفا کاری نہ لے منت دلآزاری
ستمگر کے ستم بھی اب تو احساں ہوتے جاتے ہیں

ذہین اک عمر جن کو دشمنِ ایمان ودیں سمجھا
وہی بت ہیں کہ معبودِ دل وجاں ہوتے جاتے ہیں



تجھے تجھ سے چھپا کر دیکھتا ہوں
نگاہوں سے بچا کر دیکھتا ہوں

نظر میں تم ہو دل میں تم ہو، تم کو
نظر سے دل میں لا کر دیکھتا ہوں

ظہور وغیب دونوں ایک سے ہیں
نظر سے دل ملا کر دیکھتا ہوں

جہاں میری نظر جائے ، نہ آنا
تمہیں، تم سے چھپا کر دیکھتا ہوں

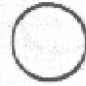
کہاں تک ساتھ ہو تم پاس ہو تم
میں تم سے دور جا کر دیکھتا ہوں

ترے رخ پر کوئی پردہ نہیں ہے
میں ہر پردہ گرا کر دیکھتا ہوں

میں شبنم ہوں وہ خورشیدِ جہاں تاب
نظر ان سے ملا کر دیکھتا ہوں

بہت دن تم میں چھپ کر میں نے دیکھا
تمہیں خود میں چھپا کر دیکھتا ہوں

تصور نے بنائی ہے جو تصویر
ذہین اس کو مٹا کر دیکھتا ہوں



تری نگہ سے ملا کر نگاہ لایا ہوں
میں اپنے ساتھ تری جلوہ گاہ لایا ہوں

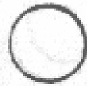
وہ دل کہ جس میں ہے تیری نگاہ لایا ہوں
نگاہِ حسن محبت پناہ لایا ہوں

نقاب اُن کا جب اُٹھے مری نگہ بھی اٹھے
کہیں میں بھول نہ جاؤں نگاہ لایا ہوں

تمہارے پاس کوئی رسم و راہ لا نہ سکی
تمہارے پاس نئی رسم و راہ لایا ہوں

نگاہِ عشق کے، عشقِ نگاہ کے بدلے
نگاہِ حسن سے حسنِ نگاہ لایا ہوں

ذہین تازہ ادا حسن کے حضور میں آج
جو لب پر آ نہ سکی تھی وہ آہ لایا ہوں



مشرقستانِ مہ و مہر ہے پنہاں دل میں
پڑ گیا پرتوِ روئے شہِ خوباں دل میں

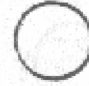
میرے نزدیک تو رکھتا ہے وہ ایماں دل میں
جو گنہ گار کہ ہو جائے پشیماں دل میں

حرم و دیر کی منزل میں بھٹکنے والے
دیکھ آتا ہے نظر جلوۂ جاناں دل میں

اُن کے دیدار کی حسرت میں بھی کیا کم ہے مزا
آنکھ میں ذوقِ نظر، شوقِ فراواں دل میں

یہ بھی معلوم کہ ارمان ہے سامانِ حیات
یہ بھی کوشش ہے کہ رہ جائے نہ ارماں دل میں

رات دن عشقِ بتاں کیوں ترا شیوہ ہے ذہین
آخر انصاف تو کر مردِ مسلماں دل میں



بتوں پہ ہے مرا ایمان جانتا ہوں میں
دل و نظر کو مسلمان جانتا ہوں میں

مذاقِ غم کی یہ مشکل پسندیاں دیکھیں
کسی کے عشق کو آسان جانتا ہوں میں

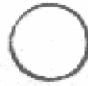
نہ بے رُخی ہو تو پھر کیا بری ہے بے مہری
ترے ستم کو بھی احسان جانتا ہوں میں

ابھی حقیقتِ یک ذرّہ منکشف نہ ہوئی
ابھی جہان کو انجان جانتا ہوں میں

جنھیں غرور ہے اس بے ثبات ہستی پر
انھیں کو بے سروسامان جانتا ہوں میں

ہزار بار تجھے دیکھ کر نہ دیکھ سکے
نگاہ تھی کہ نگہبان جانتا ہوں میں

کسی کی زُلفِ پریشان کا آئینہ ہے یہ حال
ذہین کیوں ہے پریشان جانتا ہوں میں



التفاتِ ناز کا مطلب غلط سمجھا کریں
کیا دلِ بے آرزو میں آرزو پیدا کریں

کیا کریں آخر محبت کی نگاہیں کیا کریں
حُسن کے دل میں بھی ذوقِ آرزو پیدا کریں

ہم تصور میں تری تصویر کو پوجا کریں
دل میں رکھ کر دل کی آنکھوں سے تجھے دیکھا کریں

کام لیں کچھ اپنے حسن و عشقِ لامحدود سے
آ کہ اس دُنیا کے ہر ذرے کو ہم دنیا کریں

میری آنکھوں میں امانت ہیں تمہارے حُسن کی
وہ نگاہیں جو تمہیں خود بین و خود آرا کریں

اُن کو سوزِ عشق کے نغمے سنانے ہیں ذہین
وہ یونہی مضرابِ غم سے سازِ دل چھیڑا کریں

بس اُن کی خوشی جاننا چاہتا ہوں وہ خود جانتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں
سکونِ دلِ مبتلا چاہتا ہوں غمِ عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میں خود اپنی نسبت سے کیا چاہتا ہوں تمہارا ہی چاہا ہوا چاہتا ہوں
وفا ہی جوابِ وفا چاہتا ہوں جنونِ محبت یہ کیا چاہتا ہوں
نہ خود عشق واقف نہ خود حسن آگاہ وہ کیا چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں
تمنا کا مفہومِ نازک سمجھ کر تمنا سے کچھ ماورا چاہتا ہوں
ترے سامنے محویت میں نہ سمجھا میں کیا چاہتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں
نہ ہے جلوۂ نا مکرر کہ ہر دم تمہیں دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں
محبت میں ہر مدعا سے گزر کر میں تکمیلِ ہر مدعا چاہتا ہوں
ذہین اپنے دل سے کیا جس نے بدل
وہی غمزۂ دل ربا چاہتا ہوں

دیکھ کر عجزِ نظر، دیکھا گیا تھا یا نہیں
جو نظر میں تھا، نظر نا آشنا تھا یا نہیں

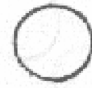
کس کو یاد آیا پہنچ کر تیری بزمِ ناز میں
کفر و دیں سے کچھ ہمارا واسطا تھا یا نہیں

کون کہہ سکتا ہے تیرے سامنے آنے کے بعد
اور بھی کچھ اپنے دل میں مدعا تھا یا نہیں

وہ ترا معصومیت کے ساتھ اقرارِ وفا
ہو نہیں سکتا وہ اندازِ جفا تھا یا نہیں

عشق نے اے بت خدا تجھ کو بنایا ہے مگر
تو خدا ہونے سے پہلے بھی خدا تھا یا نہیں

دامنِ دل میں گلِ رخسار کیا تھے اے ذہین
آئینے سے آئینے کا سامنا تھا یا نہیں



نہ ہوں میں قابلِ گلشن نہ میں شایانِ محفل ہوں
میں اک پژمردہ غنچہ ہوں میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

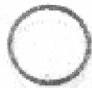
اجل کو مجھ سے نفرت ہے، مری جاں ننگِ ہستی ہے
نہ میں جینے کے لائق ہوں نہ میں مرنے کے قابل ہوں

پڑھو مجھ کو کہ ہوں افسانۂ سوزِ غمِ پنہاں
سنو مجھ کو کہ آوازِ شکستِ شیشۂ دل ہوں

فروغِ بزمِ محسوسات ہوں سوزِ مجسم ہوں
میں پروانے کی قسمت ہوں نصیبِ شمعِ محفل ہوں

مرا ذوقِ تجسس مانعِ منزل شناسی ہے
کہ آپہنچا ہوں منزل پر مگر گم کردہ منزل ہوں

مگر حرفِ مقدر ہے ذہین اپنا مقدر بھی
بمشکل لب پہ آسکتا ہوں میں وہ حرفِ مشکل ہوں



میں جذب ہو چکا ہوں جلوہ فشانیوں میں
میرا شباب ڈھونڈو، اپنی جوانیوں میں

کہتے ہیں عشق جس کو وہ حسن کی جھلک ہے
کیوں میرا نام آئے ان کی کہانیوں میں

وہ میرے پاس ہی تھے وہ میرے ساتھ ہی تھے
لیکن چھپے ہوئے تھے کچھ بدگمانیوں میں

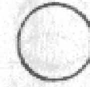
پارینہ ہو چلی ہے کچھ طور کی حکایت
آؤ کہ جان ڈالیں پھر لن ترانیوں میں

یہ سلسبیل و جنت زاہد! تجھے مبارک
سب خشک تذکرے ہیں رنگیں بیانیوں میں

حسرت بھری نگاہیں کیا کام کر رہی ہیں
گویا مری زباں ہے اِن بے زبانیوں میں

جب سامنے وہ آئے بیگانہ وار آئے
نامہربانیاں ہیں کیا مہربانیوں میں

وہ بے قصور نکلے میں ہی ذہین خود تھا
دل کی تباہیوں کے بانی مبانیوں میں



ہم بتا دیں گے کہ یوں تم سے ملا کرتے ہیں
ہم دکھا دیں گے کہ اس طرح مٹا کرتے ہیں

تیرے آنے کی جو دن رات دعا کرتے تھے
موت کی آج وہ دیوانے دعا کرتے ہیں

تابشِ حُسن کو تم سوزِ محبت سمجھو
شمع جلتی ہے تو پروانے جلا کرتے ہیں

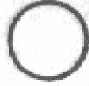
جانتے ہیں کہ نہیں اسم، مسمّیٰ سے جُدا
رات دن آپ کا ہم نام لیا کرتے ہیں

قابلِ رحم ہے بے چارگیٔ اہلِ وفا
وہ جفا بھی ذرہِ لطف و عطا کرتے ہیں

شکر ہے حسن و محبت میں ہے نسبت قائم
یہ بھی صد نازِ وفا ہے کہ جفا کرتے ہیں

مل گئے آپ تو کیا معذرتِ جَور و ستم
اتفاقات کچھ ایسے بھی ہوا کرتے ہیں

کس قدر وہ بُتِ کافر ہے خفا ہم سے ذہین
جب سے سن پایا کہ ہم یادِ خدا کرتے ہیں



پامالِ خرامِ ناز کریں مقتل کی ہمارے زمیں نہ کہیں
وہ جن کو سمجھتے ہیں ذرّہ عشاق کی ہوں یہ جبیں نہ کہیں

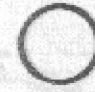
ہم دیر میں جس کو ڈھونڈتے ہیں ہم جس کو حرم میں دیکھتے ہیں
ہو بزمِ نظر سے قریں نہ کہیں ہو خانۂ دل میں مکیں نہ کہیں

اللہ رے تمہارا استغنا اللہ رے ہماری محرومی
جو باتیں تم نے سنیں نہ سنیں جو باتیں ہم نے کہیں نہ کہیں

یہ رعبِ جمال معاذ اللہ یہ تابشِ حسن خدا کی پناہ
جھک جھک کے کرے سجدے تجھ کو یہ چشمِ حقیقت بیں نہ کہیں

کس آس پہ آخر کوئی جیے وہ آئے اگر چل بھی دیئے
جو باتیں سنی تھیں نہ سنیں جو باتیں کہنی تھیں نہ کہیں

افسردگی اہلِ محفل کی پہچان ہے میرے ہونے کی
گھبرا کے وہ خود فرمانے لگے دیکھو تو یہاں ہو ذہین نہ کہیں



مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ خاموش ہوں میں
ورنہ غوغا بدل وصور در آغوش ہوں میں

میری ہر سانس میں آباد ہے دنیائے فنا
حشر بر دوش ہوں میں نشر در آغوش ہوں میں

میں سمجھتا ہوں فقط اپنے جنوں کی غایت
ہوش اتنا مجھے باقی ہے کہ بے ہوش ہوں میں

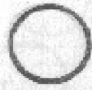
شکر ہے بعد مرے یاد ہے میری باقی
بزمِ امروز میں اک تذکرۂ دوش ہوں میں

میرے جذباتِ محبت کی نہ توہین کریں
کاش سمجھیں کہ وفا کیش وفا کوش ہوں میں

کیا عجب ہے تہ و بالا ہو نظامِ عالم
آہِ پر سوز ہوں میں نالۂ پر جوش ہوں میں

مقصد اخفائے غمِ دل نہیں واللہ ذہین
غرض افشائے غمِ دل ہے کہ خاموش ہوں میں

مطبوعہ روزنامہ انقلاب ۱۹۲۶ء



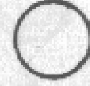
سو نقش بناتا ہوں سو نقش مٹاتا ہوں
تصویر تری جب سے ہر نقش میں پاتا ہوں

تفسیر دو عالم کی نیرنگِ تمنا ہے
میں شرحِ دو عالم ہوں نیرنگِ تمنا ہوں

مستی ہم آغوشی ہے عالمِ بے ہوشی
پڑ جاتے ہیں پردے سے جب ہوش میں آتا ہوں

خوشنودیٔ جاناں میں ملحوظ ہے خوشنودی
ہر بات میں راضی ہوں ہر حال میں اچھا ہوں

کیفیتِ دل لائی یہ رنگ ذہین آخر
کچھ لوگ سمجھتے ہیں مستِ مئے مینا ہوں



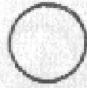
اٹھا کر میں کہاں لے جاؤں اس محفل کی محفل کو
یہاں کا ذرہ ذرہ کھینچتا ہے دامنِ دل کو

محبت نے محبت زندگی کی چھین لی دل سے
میں خود کو کوستا ہوں اور دعا دیتا ہوں قاتل کو

مرے ذوقِ فنا کی کس طرح تکمیل ہو یارب!
اٹھا کر ڈال دے گرداب میں جب کوئی ساحل کو

حقیقت آشنا کیا قیس تھا صورت پرستی میں
کہ جو سجدہ تھا محمل کو وہ تھا لیلائے محمل کو

ادائے خاص کا پردہ ہجومِ عام کو دیکھا
ذھینؔ اک گوشۂ خلوت سمجھئے ان کی محفل کو



مری ہر بات پر کیا ہو مری ہر عرض پر کیوں ہو
بتائیں آپ ہی رودادِ غم پھر مختصر کیوں ہو

اگر ہے زندگی تو ہے مآلِ زندگی لازم،
نہ ہو آماجگاہِ تیرِ جاناں تو جگر کیوں ہو

مرے مر مر کے جینے سے ہے اچھا میرا مر جانا
جو ہو تقدیر اچھی تو دعاؤں میں اثر کیوں ہو

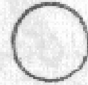
مجھے تیرے تغافل کا نہیں شکوہ یہ رونا ہے
کہ میرے حال کی تجھ کو اگر ہو تو خبر کیوں ہو

تلا بیٹھا ہوں مرنے پر مگر یہ سوچ کر چپ ہوں
کہ میری کامیابی وجہِ یاسِ چارہ گر کیوں ہو

میں تیرے اس ستم سے خوش ہوں جو مجھ پہ ہے مجھ تک ہے
ہے جبتک غیر پر، مجھ پر عنایت کی نظر کیوں ہو

ذھینؔ آزاد رہ فرسودہ و پامال راہوں سے
گزرتے ہیں جدھر سے غیر تیری رہ گزر کیوں ہو

BZSTRFT



سر ہو اور سنگِ درِ جانانہ ہو مستقل یہ شوقِ بیتابانہ ہو

عاشقی ہے بے نیازِ این و آں تو نہیں تو کعبہ و بت خانہ ہو

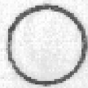
نذرِ سوزِ ناگہانی! مرحبا شمع سے کہدے کوئی پروانہ ہو

حسن و الفت ایک شے ہیں ورنہ کیوں میرا افسانہ ترا افسانہ ہو

غیرتِ حسن اب تو دل سے شرم کر جو ترا کاشانہ ہو، ویرانہ ہو

عشق کے اسرار، مستی کے رموز وہ سمجھ سکتا ہے جو دیوانہ ہو

پھر کوئی سجدہ طلب ہے اے ذہین
کیوں نہ ہم سے لغزشِ مستانہ ہو



فدا کر کے نشاطِ زندگی کو
دعائیں دے رہا ہوں میں کسی کو

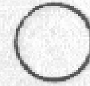
کوئی لیتا ہے جنسِ رائیگاں کیا
لٹاتا ہوں متاعِ عاشقی کو

کوئی مٹتا رہے تیرے غضب پر
کوئی روتا رہے تیری ہنسی کو

تصور میں بھی ہے شانِ تحیر
میں خود کو دیکھتا ہوں یا تجھی کو

وہ جن کو ہوش ہے کچھ جانتے ہیں
دلیلِ آگہی بے آگہی کو

اگر نظارۂ یوسفؑ ہو مطلوب
کوئی دیکھے ذہینِ یوسفی کو



دلِ دیر و حرم بیتاب ہے سجدہ فشانی کو
سمجھتے ہیں خدا گبر و مسلماں اس جوانی کو

نگاہیں مضطرب ان کی ادائیں بے قراراں کی
میں کن آنکھوں سے دیکھوں جلوہ گر سوزِ نہانی کو

یہی اک جلوۂ آنی ازل بھی ہے ابد بھی ہے
نہ لے اس لمحے کی قیمت میں عمرِ جاودانی کو

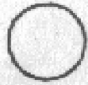
فسونِ حسن تھا افسانۂ حسنِ نظر اپنا
ہم اُن کی داستاں سمجھا کیے اپنی کہانی کو

وہ مہر و قہر دونوں ایک ہوں تو دل کی قسمت ہے
مگر میں مہربانی ہی کہوں گا مہربانی کو

بشانِ جاں نوازی نزع میں وہ بے حجاب آئے
خضر کیا کیا نہ ترسیں گے بہارِ عمرِ فانی کو

بہت کچھ معتقد زاہد ہے خلدِ شامِ پیری کا
مگر جب تک نہ دیکھے جنتِ صبحِ جوانی کو

ذہین آخر وہاں ہم ہوش میں آئیں تو کیوں آئیں
جہاں دیوانگی لازم ہو ان کی رازدانی کو



مجھ سا کوئی اسیرِ غمِ جستجو نہ ہو؟
اب یہ تلاش ہے کہ کہیں مجھ میں تو نہ ہو

مقصودِ کیفِ بے خودیٔ شوق ہو تمہیں
تم ہو اگر نگاہ میں جام و سبو نہ ہو

کس کس کو اس چمن میں گلے سے لگائیے
وہ گل نہیں کہ جس میں ترا رنگ و بو نہ ہو

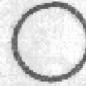
قصد و طلب حجاب ہیں ان کو اٹھائیے
جس کی تلاش ہے وہ کہیں روبرو نہ ہو

حدِ نظر سے دور نہیں ہے ابھی نظر
یہ ہو تو کائناتِ نظر تو ہی تو نہ ہو

کیا عالمِ وصال کی ہیں بے نیازیاں
یہ آرزو ہے اب کہ کوئی آرزو نہ ہو

کیا دے خراج دیدۂ خونابہ بار کو
اک قطرہ جس غریب کے دل میں لہو نہ ہو

سوئے حرم نگاہ مقید نہ ہو ذہین
عاشق نہیں وہ جس کی نظر چار سو نہ ہو

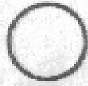


پھر دکھاؤ گے کب اعجازِ تکلّم مجھ کو
اب مسیحا بھی سنانے لگے قُم قُم مجھ کو

یار بیں آنکھیں ہوئیں یار نما قلب ہوا
ذرّے ذرّے میں نظر آنے لگے تم مجھ کو

میں نے مانا کہ ترحّم نہیں عادت ان کی
کیا کروں پھر بھی ہے امیدِ ترحّم مجھ کو

تھم نہ جائیں کہیں آنسو نہ رُکے آہ ذہین
لوٹ لے جائے نہ شوخیِ تبسّم مجھ کو



محبت میں ہے معیارِ پرستش ہی جداگانہ
مری دنیائے طاعت میں نہ کعبہ ہے نہ بتخانہ

یہ دیوانہ سمجھ کر التفاتِ بے حجابانہ
کوئی ہشیار بھی ہوتا تو ہو جاتا وہ دیوانہ

کئی میدان ہیں ہونے کو یوں تو قصۂ غم میں
مگر جو تم کو تڑپا دے وہی ہے میرا افسانہ

مآلِ جذبِ الفت میں کشش ہے حسن کی پنہاں
نہیں نازِ محبت بے نیازِ حسنِ جانانہ

شراب و شاہد و ساقی یقیناً ایک ہیں لیکن
نہیں ہے ایک میخانے میں تو مستی کا پیمانہ

ذہین اُن کا تصور ہی ہمیں سامانِ مستی ہے
جہاں بھی جھوم کر بیٹھیں وہیں بن جائے میخانہ

اپنے اندازِ تغافل پہ ہے نازاں کوئی
نہ ہو یارب ! اثرِ آہ ، نمایاں کوئی

غیر پر چشمِ کرم کا نہیں امکاں کوئی
کیوں رہے ان کی نگاہوں کا نگہباں کوئی

بت وہ رہے ابھی غارت گرِ ایماں کوئی
ہو نہ ہو بزم میں ہے مردِ مسلماں کوئی

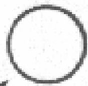
نہ رہا قصد و طلب کا وہ تکلف باقی
ساتھ دوری و حضوری میں ہے یکساں کوئی

شرحِ حسن کے دو نام ہیں پروانۂ و شمع
شعلہ پیکر ہے کوئی شعلہ بداماں کوئی

کیا شعاعِ نگہِ ناز تھی اللہ اللہ
جیسے دل میں اتر آئی ہو رگِ جاں کوئی

اس طرح دشت نوردی کو چلے دیوانے
جیسے کھینچے لئے جاتا ہو گریباں کوئی

منفعل شکوۂ بیداد سے ہیں خود یوں ذہین
نظر آتا ہے مجھے آج پشیماں کوئی



ادا ہے بے نقابی میں تجلیاتِ پنہاں کی
کہ یہ ہنگامہ زارِ دوجہاں خلوت ہے جاناں کی

نزاعِ کفر و ایماں جنگِ عقل و عشق مٹ جائے
دکھا دو تم جھلک بے پردہ ہو کر روئے تاباں کی

کمالِ بے حجابی خود حجابِ روئے جاناں ہے
کہ شامیں وصل کی راتوں میں ہیں شبہائے ہجراں کی

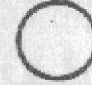
میں خود کو دیکھتا ہوں پوچھتا ہوں دور سے تکتا ہوں
مری صورت سے ہے ملتی ہوئی تصویر جاناں کی

نظر سے اٹھتے اٹھتے اٹھ گئے پردے جدائی کے
تصور بنتے بنتے بن گیا تصویر جاناں کی

نیازِ عشق و نازِ حسن دونوں ایک ہیں یعنی
مری ہستی ہے خود مسجودِ اپنی چشمِ عرفاں کی

رگوں سے نبض سے دل سے نفس سے ہر بنِ مو سے
صدائیں سن رہا ہوں میں نوا سازِ رگِ جاں کی

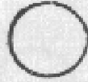
ذہین ابنِ فراقی جز فریبِ نام میں کیا ہوں
مری ہستی حقیقت میں ہے ہستی شاہِ خوباں کی



تشریحِ عشق حسن کی تفصیل ہوگئی
تصویرِ یار خود مری تخئیل ہوگئی

دل کو گراں نہیں تری بے التفاتیاں
شاید جنونِ عشق کی تکمیل ہوگئی

میں اور پرستشِ نگہِ ناز اے ذھین
فطرت کے حکمِ خاص کی تکمیل ہوگئی



اضطرابِ دل کا حاصل ہوگئی
اب نظر تیری مرا دل ہوگئی

آئینہ نکلا حقیقت کا مجاز
قیس کو لیلےٰ ابھی محمل ہوگئی

غمزۂ قاتل ہے خنجر آزما
ہر نگاہِ شوق بسمل ہوگئی

آئینہ ساماں ہے حسنِ بے حجاب
ہے یہی خلوت کہ محفل ہوگئی

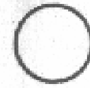
روح کانپ اٹھی دکھا مجروح دل
یاد بھی قاتل کی قاتل ہوگئی

شکریہ کیا التفاتِ حسن کا
جب محبت جذبِ کامل ہوگئی

بیقراری تھی محبت کا سفر
دل جہاں ٹھیرا وہ منزل ہوگئی

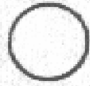
اللہ اللہ گرمیِ بازارِ حسن
یک نظر صد قیمتِ دل ہوگئی

کھو گیا ان کے تجسس میں ذھین
شکر ہے آسان مشکل ہوگئی



کبھی محفل جو سجاؤں دل کی — تم کو تصویر بناؤں دل کی
تم نے آئینۂ محفل دیکھا — میں تمہیں سیر کراؤں دل کی
دل کی کیا بات ہے، تم ہی دل ہو — دل سے کیا بات چھپاؤں دل کی
دل سے جا کر تو دکھاؤ مجھ کو! — میں کرامات دکھاؤں دل کی
تم کو افسانہ بنا رکھا ہے — کیا تمہیں بات بتاؤں دل کی
اک اچٹتی سی نظر سب کچھ ہے — کچھ خبر میں بھی نہ پاؤں دل کی

وہ نہوں دل میں تو ظاہر ہے ذہین
میں کہاں خیر مناؤں دل کی



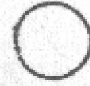
تمہیں کہہ دو کہ لے کر سوزِ دل جائے کہاں کوئی
نہ ہو اس انجمن میں جب کسی کا رازداں کوئی

نگاہِ ناز میں اندازِ آگاہی نمایاں ہے
سنائے گا انھیں کیا قصۂ دردِ نہاں کوئی

سکونِ جاوداں دل کے لئے جب نامناسب ہے
تو ہاں اے چشمِ جاناں اضطرابِ جاوداں کوئی

بچاتا نا امیدی سے فریبِ جستجو کب تک
نہ پاتا تھا نہ پایا نقشِ پائے رفتگاں کوئی

تمنائے سکوں سے باز آ ڈرونِ کی دنیا میں
ذہین اچھا بناتا ہے قفس میں آشیاں کوئی



آنکھیں بچھائے کوئی کہ سجدہ کرے کوئی
تم سامنے جب آؤ تو کیا کیا کرے کوئی

کیوں آنکھ کو خرابِ تماشا کرے کوئی
تیری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

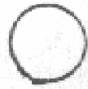
میری نظر ہے پرتوِ آئینۂ جمال
پردہ کرے کوئی کہ نہ پردا کرے کوئی

لازم حیات کو ہے مآلِ حیات بھی
دل ہے اگر تو درد بھی پیدا کرے کوئی

ہیں کم نگاہیوں سے تری بے حجابیاں
دیکھا کرے تجھے تو نہ دیکھا کرے کوئی

اب عالمِ خیال ہے جلوہ گہِ جمال
فرصت کہاں کہ آنکھ بھی اب وا کرے کوئی

پاتا ہوں اب خیال کو میں واقعہ ذھین
اب دیکھ کر خیال میں آیا کرے کوئی



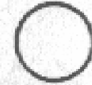
وہ بے پناہ تجلی تری کہ آنی تھی
مجھے متاعِ خلشہائے جاودانی تھی

اُدھر نگاہ تھی پرسانِ آرزوئے وصال
اِدھر زبانِ سوال اپنی بے زبانی تھی

اگر سکون نہ تھا تو خلش محبت میں
بہائے لذتِ آرامِ زندگانی تھی

کھنچے تھے وہ تو ذرا اور بھی کھنچے رہتے
کشش ہیں بھی محبت کی آزمانی تھی

حیات و موت، وصال و فراق، درد و سکوں
نگاہِ عشق میں ہر شے ذھین فانی تھی



کچھ بھی ہم کو نہ آگہی ہوتی — موت ہوتی نہ زندگی ہوتی
کاش خوددار، بےخودی ہوتی — موت آتی تو زندگی ہوتی
دیکھتے آئینہ میں وہ صورت — جمع یکتائی و دوئی ہوتی
کہہ گئے جب زبان سے وہ نہیں — وہ نظر ہاں نہ کہہ گئی ہوتی
اَرِنی تھی مزے کی چھیڑ کلیم — کاش ان سے کبھی کبھی ہوتی
بزمِ کثرت فریبِ ہستیٔ غیر — یہ نہ ہوتا تو ایک ہی ہوتی
گر نہ ہوتی کمی گناہوں میں — تیری رحمت میں کیا کمی ہوتی

جو نہیں تھے ذہین خود آگاہ
کیا انھیں حق سے آگہی ہوتی



جو دید تھی وہ حسرتِ دیدار ہو گئی
میری نظر نقابِ رُخِ یار ہو گئی

جلوے بھی ہیں حجاب کا پہلو لئے ہوئے
شکلِ نمود مانعِ اظہار ہو گئی

بے ہوشیاں ہیں طالبِ کیفِ مدام ہوش
شاید کہ بے خودی مری خوددار ہو گئی

توہینِ حسنِ یار تھا قصدِ نگاہ بھی
دیکھا نہ تھا کہ آنکھ گنہگار ہو گئی

الٹی جو اس نے چہرۂ گلرنگ سے نقاب
دنیا تمام مصر کا بازار ہو گئی

جس میں ذہین لاکھ نشیب و فراز تھے
وہ راہ فیضِ عشق سے ہموار ہو گئی

BZSTRFT

اپنا وجود راز ہے اپنے ہی سے سہی — حاصل ہمیں نیاز ہے اپنے ہی سے سہی

شانِ ظہور ناز ہے اپنے ہی سے سہی — کوئی ادا نواز ہے اپنے ہی سے سہی

کیوں منظرِ جمال ہو شرمندۂ نظر — روشن حریمِ ناز ہے اپنے ہی سے سہی

کیا کم ہے یہ کہ نازِ وجود اپنی ذات ہے — حاصل اک امتیاز ہے اپنے ہی سے سہی

ہنگامہ زارِ دہر کی فتنہ طرازیاں؟ — درکار احتراز ہے اپنے ہی سے سہی

ہاں دردِ دل مآلِ غمِ روزگار ہے — اک سوز اک گداز ہے اپنے ہی سے سہی

دیکھو حیا کہ خلوتِ آئینہ خانہ میں — شرمندہ خود طراز ہے اپنے ہی سے سہی

وہ جلوہ گر ہے آئینہ خانے میں اے ذہین
اپنا ہی وہ مجاز ہے اپنے ہی سے سہی

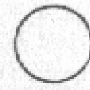
نہ تم سے التجا کوئی نہ تم سے مدعا کوئی
مبارک ہو ہلاکِ شانِ استغنا ہوا کوئی

حسینوں کو خدا پیدا نہ فرماتا تو کیا ہوتا
نہ ان کو دیکھتا کوئی نہ ان کو پوجتا کوئی

نہیں معلوم رازِ بے خودی، ہاں یاد ہے اتنا
مرے پہلو میں ہنگامِ وداعِ ہوش تھا کوئی

بس اک دردِ محبت دم میں دم جب تک تھا کام آیا
نہ کام آئی دوا کوئی نہ کام آئی دعا کوئی

ذہین اک دائرہ ہوں حیرتِ دورِ تسلسل کا
نہ میری ابتدا کوئی نہ میری انتہا کوئی



مجھے مرنے میں حاصل انبساطِ زندگی ہوتی
مگر اے کاش میری موت میں تیری خوشی ہوتی

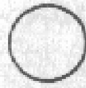
برا کیا تھا جو ضبطِ درد میں کوئی کمی ہوتی
نہ کہتا کیوں اگر رودادِ الفت گفتنی ہوتی

کمالِ جستجو میں میری حیرت دیدنی ہوتی
وہ ملتے اور وجہِ جستجو گم ہو گئی ہوتی

تم آتے بزم میں اور بے نقاب آتے تو کیا ہوتا
تمہارے حسن کا پردہ ہماری بیخودی ہوتی

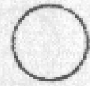
محبت تھی اگر کامل تو کیا تیرے تصور میں
مری تصویر بنتی اور بن کر مٹ گئی ہوتی ؟

وہی دل ہے وہی بیتابیاں دل کی ذہین اب بھی
وہ آئے تھے تو ان کو دیکھ کر تسکین بھی ہوتی



وہ نظر جب دل کی قسمت ہو گئی — زندگانی خوابِ راحت ہو گئی
جب غمِ دنیا سے فرصت ہو گئی — ساری دنیا تیری خلوت ہو گئی
جو کرم مجھ پر ہے وہ سب پر نہیں — شکر میں پیدا شکایت ہو گئی
کل وفا بھی تھی دل آزاری کی بات — اب جفا بھی اک عنایت ہو گئی
وہ غرورِ حسن آخر کیا ہوا — سچ کہو کس سے محبت ہو گئی
جھک گیا دل یوں کسی کو دیکھ کر — کاش سجدوں کی حقیقت ہو گئی

پھر خدا کا ذکر بھی ہو گا ذہین
ہم کو جس دن خود سے فرصت ہو گئی



خدا کے سامنے بھی کچھ نہ کہہ سکا کوئی
یہ ظلم تھا کہ ترا التفات تھا کوئی

پھر ایک بار مٹا دعوئ سکوں دل سے
پھر ایک دن نگہِ صبر آزما کوئی

نثارِ بے دلیِ شوق اور کیا کہیے؟
وہ پوچھتے ہیں کہ ہے دل میں مدعا کوئی

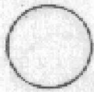
اب اضطراب میں بھی ہے سکون کا عالم
قرار سوز نہیں ہے تری ادا کوئی

کہا بھی حال تو دیوانگانِ الفت نے
کچھ اس ادا سے کہ مطلب نہ ہو ادا کوئی

نقاب اٹھائیے محفل میں کس سے پردہ ہے
جہاں ہیں آپ نہیں آپ کے سوا کوئی

چھڑا کے چل دیئے دامن وہ میرے ہاتھوں سے
یہ پوچھتا ہی رہا میں، مری خطا کوئی

خصین قطعِ تعلق کیا زمانے سے
کہیں نہیں ہے مرے درد کی دوا کوئی



بے تابیِ گوناگوں سے غرض اس دل کو شکیبا ہونا ہے
جینا ہے تو کیا کرنا ہے مرنا ہے تو کیا ہونا ہے

اٹھ اپنی نظر کے پردے کو منظورِ نظر کے رُخ سے اٹھا
مایوسِ تماشہ ہونا ہی مانوسِ تماشا ہونا ہے

یہ اسم و مسمیٰ کی قیدیں اٹھتی ہیں کمالِ الفت میں
لیلیٰ کو مجنوں ہونا ہے، مجنوں کو لیلیٰ ہونا ہے

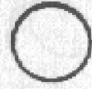
روکے سے رُکی نہ رکے گی کبھی اس حُسن کی عالم آرائی
ہر ذرہ سورج بنتا ہے ہر قطرہ دریا ہونا ہے

اب تنگ ہے حُسنِ خود بیں پر دنیائے حریمِ آئینہ
دنیا کو شیدا کرنا ہے دنیا پر شیدا ہونا ہے

تم مقصودِ دو عالم ہو اور تم سے عبارت دو عالم
یہ دونوں جہاں کا افسانہ اک حرفِ تمنا ہونا ہے

انجامِ محبت سے واقف وہ حُسنِ برہم ہو تو ہو
کیا جانے انھیں کیا کرنا ہے کیا جانے مجھے کیا ہونا ہے

کیا کہیے ابنِ فراقی سے مجبور ہے دردِ الفت سے
اب ختم حدودِ ضبط ہوئیں اس راز کو افشا ہونا ہے



کہاں حسن کی رازِ حقیقت ہوتی جاتی ہے
مجھے بزمِ دو عالم تیری خلوت ہوتی جاتی ہے

غمِ دنیا ہی کیا دنیا سے فرصت ہوتی جاتی ہے
محبت میں محبت ہی محبت ہوتی جاتی ہے

ستم مجھ پر نہ کرنا ان کی عادت ہوتی جاتی ہے
جفا بھی میرے حق میں اب عنایت ہوتی جاتی ہے

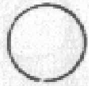
قریبِ جلوہ گاہِ یار شاید ہوتا جاتا ہوں
کہ مجھ سے کائناتِ ہوش رخصت ہوتی جاتی ہے

دلِ ہر ذرہ سرشارِ تجلی طالبِ سجدہ
مری روحِ نظر مدہوشِ طاعت ہوتی جاتی ہے

سجودِ شوق کرتا ہوں نچھاور پائے ساقی پر
مری ہر لغزشِ مستانہ طاعت ہوتی جاتی ہے

ترے جلوے محبت کی ادائیں ہوتے جاتے ہیں
مری صورت سے ظاہر تیری صورت ہوتی جاتی ہے

ذہینِ مضطرب میں ہوں سکونِ یار کی دُنیا
یہ بیداری کسی کا خوابِ راحت ہوتی جاتی ہے



کیا نزع کا عالم بھی ہنگامِ تماشا ہے
دیکھو نگہِ آخر جاتی ہوئی دنیا ہے

محرابِ تصور میں جب سے تجھے پوجا ہے
دل کافرِ کعبہ ہے مردودِ کلیسا ہے

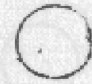
تکمیلِ محبت ہی توحید کا منشا ہے
وامق کی نگاہوں میں دنیا ہے کہ عذرا ہے

وحدت کی حقیقت ہے یہ کثرتِ صورت بھی
مقصودِ دو عالم سے اک عشرتِ تنہا ہے

ہر لحظہ ترا جلوہ اک دوسری صُورت میں
اور مجھ کو یہ محویت شاید تجھے دیکھا ہے

دو خوابِ عدم میں ہے یک لمحۂ بیداری
یہ وقفۂ بیداری اک خوابِ تمنا ہے

مستی کی حقیقت بھی ہستی ہے ذہین اپنی
میخانۂ گیتی میں جو کچھ بھی ہے اپنا ہے



غم یہ ہے کم نہ غمِ سوزِ تمنا ہو جائے
کہیں آتشکدۂ حُسن نہ ٹھنڈا ہو جائے

حُسن کا فر ہے مرے حسنِ نظر پہ حاکم
آج کعبے سے میں کہدوں تو کلیسا ہو جائے

حُسنِ سرشارِ تجلی کو نہیں ہوشِ نقاب
ذرہ ذرہ نہ کہیں دیدۂ بینا ہو جائے

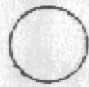
بتکدہ ہے کہ تصور ہے، حرم ہے کہ خیال
دُور از دیر و حرم ذوقِ تماشا ہو جائے

ہے بس امید پہ دُنیائے محبت قائم
وہ بھی وعدہ کوئی وعدہ ہے کہ پورا ہو جائے

عجزِ نظارہ بھی اعجازِ نظر ہے شاید
کیوں نظر ورنہ حجابِ رُخِ زیبا ہو جائے

کس قدر رحم کے قابل ہے وہ مجبورِ وفا
تیری نسبت سے جسے غم بھی گوارا ہو جائے

ساتھ ہر سب کے مگر سب سے الگ بھی ہے ذہین
اس بھری بزم میں جب چاہے وہ تنہا ہو جائے



محبت اور تکمیلِ محبت کا یہ حاصل ہے
وہی ہے چارہ سازِ دل، وہی غارتگرِ دل ہے

تمنائے سکوں کب مدعائے رقصِ بسمل ہے
نمایاں اس تڑپ میں جنبشِ بازوئے قاتل ہے

مرا ذوقِ نظر یارب کہاں صرفِ پرستش ہو
یہاں ہر ذرہ صورت خانۂ صد نقشِ باطل ہے

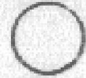
وصالِ یار مشکل ہے مگر آساں سمجھنے تک
نہاں مشکل پسندی میں کشودِ عقدِ مشکل ہے

جسے بربادئ دل سے جہاں تعبیر کرتا ہے
حقیقت میں وہ اک بربادئ کیفیتِ دل ہے

نہ تھا جب عشق تو میں تھا ہوا جب عشق تو میں ہوں
نہ تھا جب درد تو دل تھا ہوا جب درد تو دل ہے

نہ ہونا ہے مرا ہونا، نہ ہونا ہے ترا ہونا
میری محفل بھی خلوت ہے، تری خلوت بھی محفل ہے

عجب مردِ قلندر ہے ذہین ابنِ فراقی بھی
یہی دیکھا کہ وہ سب سے الگ ہے، سب میں شامل ہے



مے پرستی یہ نہیں طاعتِ جانانہ ہے
سجدہ کہتے ہیں جسے لغزشِ مستانہ ہے

خود سے بیگانہ نہیں ہے وہی بیگانہ ہے
ورنہ ہر جلوہ یہاں جلوۂ جانانہ ہے

رازِ دیوانگیٔ شوق سمجھنے والے
ہوش آتا ہے تو کہتے ہیں کہ دیوانہ ہے

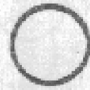
دل تری انجمنِ ناز میں کس طرح جلا
شمع اس راز سے واقف ہے نہ پروانہ ہے

خواب آلودہ نگاہوں کا وہ عالم توبہ
دیدۂ ناز میں سویا ہوا میخانہ ہے

پردۂ جلوہ گہِ ناز تھی برقِ ایمن
کوئی سمجھا کہ یہی جلوۂ جانانہ ہے

میں نہ کہتا تھا نہ سن قصۂ بربادیٔ دل
کہ حقیقت مری ظالم ترا افسانہ ہے

دل میں جب کچھ نہیں کیوں اُن کا تصور ہے رہین
ہم جسے کعبہ سمجھتے ہیں وہ بت خانہ ہے



جب میں نہ دیکھتا ہوں تو دیکھا کروں تجھے
بُت خانۂ خیال میں پوجا کروں تجھے

گھبرا گیا ہوں دیر و حرم کی قیود سے
کیا عالمِ خیال میں پوجا کروں تجھے

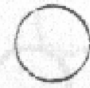
ہاں کیوں رہے شریکِ عبادت خیالِ غیر
کیا میں نہیں رہا ہوں کہ سجدہ کروں تجھے

پھر کیا رہے گا ولولۂ شوقِ دید میں
اے وہ نظر کہ صرف تماشا کروں تجھے

لگ جائیں تیرے حسن کی شہرت کو چار چاند
رسوا مجھے کیا ہے تو رسوا کروں تجھے

جب ہے وفورِ حسن قصورِ نگاہ کیا
اے اعترافِ کم نگہی کیا کروں تجھے

تیری نگاہ سے تجھے دیکھا کروں ذہین
اپنی نگاہ سے بھی چھپایا کروں تجھے



وجہِ خیالِ کم نگہی خوابِ ناز ہے
دیکھے کوئی تو دیدۂ ہر ذرہ باز ہے

ناکامیٔ حیاتِ دو روزہ ہے دیدنی
دل میں ہنوز حسرتِ عمرِ دراز ہے

کیا منحصر ہے گردشِ لیل و نہار پر
سمجھا ہوں جب سے میں شبِ فرقت دراز ہے

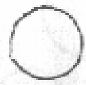
چھوڑا نہ زندگی نے کبھی رنج و غم کا ساتھ
پھر کیوں حکایتِ غمِ ہستی دراز ہے

اے انبساطِ خاطرِ احباب کیا کروں
دل آشنائے لذتِ سوز و گداز ہے

تنہائیٔ خیال اگر ہے نصیب دیکھ
عالم تمام خلوتِ راز و نیاز ہے

جویائے راز داں ہوں ملے کوئی تو کہوں
کب مجھ کو ظرفِ حفظِ سخنہائے راز ہے

پڑھتا ہوں اے ذھین نہیں ہے مگر خبر
کس کے لئے نماز ہے کس کی نماز ہے



وفائے عشق کی کچھ یادگار رہنے دے
خرامِ ناز، نشانِ مزار رہنے دے

شکایتیں ہیں تو اس کی نظر سے ہیں اے دل!
حکایتِ ستمِ روزگار رہنے دے

تری نظر میں فریبِ سکوں بھی ہے ظالم!
یہی ہو کاش کہ تو بے قرار رہنے دے

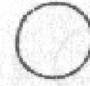
رہیں گے چشم براہ تیرے انتظار میں ہم
خدا کرے کہ ترا انتظار رہنے دے

ہزار رحم کے قابل ہے اُس کی مجبوری
جو اپنے دل پہ ترا اختیار رہنے دے

بنا رہی ہے وہ کافر نظر مجھے اپنا
جو اپنے آپ سے بیگانہ وار رہنے دے

نہیں مقامِ محبت کوئی جنوں سے اِدھر
نہ آ خیال میں تو بار بار رہنے دے

نہیں کہ میں نہیں دیوانۂ جمال ذھین
غلط کہ ہوش بجا حسنِ یار رہنے دے



تیرے لئے اپنوں سے بھی بیگانہ ہوا ہے
کیا سوچ سمجھ کر کوئی دیوانہ ہوا ہے

ہشیار ہوا ہے کہ وہ دیوانہ ہوا ہے
دل اپنا بہر حال ہوا تھا، نہ ہوا ہے

بُت اپنے نہونے سے ہیں کعبے میں نمایاں
کعبہ بھی نمائندۂ بُت خانہ ہوا ہے

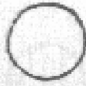
تعمیر ہوا بُت شکنی سے بُتِ پندار
بُت خانہ شکن بانیٔ بُت خانہ ہوا ہے

ہے دونوں طرف ایک ہی فطرتِ خود سوز
کیا ہو نہ سکی شمع جو پروانہ ہوا ہے

وہ بزم کہاں عشقِ جہت سوز سے آگاہ
ممتاز جہاں شمع سے پروانہ ہوا ہے

بدلا ہے فقط نام، کہانی ہے سب اُن کی
اس طرح مرتب مرا افسانہ ہوا ہے

چھائی ہے ذہین آج مئے حُسن کی مستی
ہر دیدہ و دل شیشہ و پیمانہ ہوا ہے



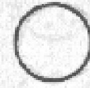
تم سے جنونِ عشق کی یہ التماس ہے
بس ایک جلوہ قیمتِ ہوش و حواس ہے

کیا آج کہہ گئی نگہِ آرزو نواز ـــ؟
کیوں آج کائناتِ تمنا اداس ہے

کیا مل گیا کہ آپ ہی کھویا ہوا ہوں میں
میں آج دور دور نہیں کون پاس ہے

ہر صورتِ مسرت و عنوانِ ہر طرب
پہچانتا ہوں غم ہے کہ غم خود شناس ہے

آیا ذہین وہم و گمان و قیاس میں
جو برتر از گمان و خیال و قیاس ہے



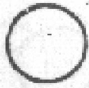
کفر ہے معراجِ عرفانی مری
بت شناسی ہے خدادانی مری

مثلِ شمع زیرِ داماں ہوں تو کیا
پردہ پوشی بھی ہے عریانی مری

موت کیا ہے میرا اندازِ حجاب
زندگی کیا شے ہے عریانی مری

غم کے ہاتھوں مر نہیں سکتا کبھی
موت کرتی ہے نگہبانی مری

میرا ہونا ہی نہ ہونا ہے ذہین
میری آبادی ہے ویرانی مری



نقشِ دل و نگاہ بنایا کروں تجھے
ہر ایک آئینے میں دکھایا کروں تجھے

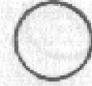
کیا صورتِ حجاب ہے قربان جائیے
تو بے نقاب ہو تو نہ دیکھا کروں تجھے

ہے ربطِ حسن و عشق کی تکمیل نامِ وصل
شک ہو تو میرے نام سے رسوا کروں تجھے

نیرنگیٔ مذاقِ پرستش تجھی سے ہے
اے سرزمینِ کعبہ! کلیسا کروں تجھے

وہ خود نمائیاں تری اللہ کی پناہ
جب تو نہ دیکھتا ہو تو دیکھا کروں تجھے

ممکن ہے ایک بار انھیں دیکھ لیں ذہین
مشکل یہ ہے وہ کہتے ہیں دیکھا کروں تجھے



جب سے میں یہ سمجھا ہوں یہ شانِ دلداری ہے
معیارِ دل داری ہی مجھ کو دل آزاری ہے

ستی کا احساس نہیں لیکن یہ احساس بھی کیوں
میرا عذرِ بے ہوشی، اقرارِ ہشیاری ہے

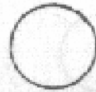
دل ان کو خود ہم نے دیا ہم خود بے بس ہو بیٹھے
یعنی اپنی مجبوری، اپنی خود مختاری ہے

واقف ہیں سب کچھ ہمدم انجامِ الفت سے ہم
آخر نکتہ چینی ہے یا کوئی غم خواری ہے

دل آن پر جب آتا ہے جان ہی لے کر جاتا ہے
موت مداوا ہے جس کا الفت وہ بیماری ہے

اب کیوں اٹھتا جاتا ہے رخ سے نقاب اٹھتے اٹھتے
دیکھو ساری محفل پر اک غفلت سی طاری ہے

حُسن کے چشم و ابرو کا ہم کو ہے عرفان ذہین
گاہ محبت جیتی ہے گاہ محبت ہاری ہے



کثرتِ حسن میں بھی عالمِ تنہائی ہے
سیکڑوں جلوے ہیں ہر جلوے میں یکتائی ہے

بے حجابی نگہِ شوق کی رسوائی ہے
جب حجابات میں بھی چشمِ تماشائی ہے

اے جنوں کونسا عالم ہے یہ اللہ اللہ
عشق مغرور ہے اور حُسن تمنائی ہے

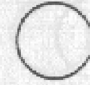
شرط ہے واقفِ آدابِ تماشہ ہونا
ورنہ ہر جلوہ یہاں جلوۂ سینائی ہے

صیقلِ سجدہ سے آئینہ ہے سنگِ درِ یار
اپنی صورت نظر اس آئینے میں آئی ہے

جز فنا چارۂ بیمارِ محبت معلوم
کہ مسیحا نفسی عذرِ مسیحائی ہے

قصۂ سرمد و منصور کا حاصل ہے یہی
کہ خطا عشق میں خاموشی و گویائی ہے

اے ذہین اب وہ سوزش، نہ تپش ہے، نہ خلش
دلِ افسردہ چراغِ شبِ تنہائی ہے



وہ حُسن کہ خود حسن کو دیوانہ بنا دے
آجائے یہاں شمع تو پروانہ بنا دے

ہُشیار بنا دے مجھے دیوانہ بنا دے
جو چاہے وہ اے جلوۂ جانانہ بنا دے

اُٹھ اے نگہِ مست کہ میخانہ بنا دے
ہر دیدہ و دل شیشہ و پیمانہ بنا دے

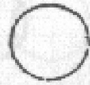
یا لذتِ بیگانگیٔ شوق عطا کر
یا اپنی نظر میں مجھے بیگانہ بنا دے

مست ادا مستیٔ عالم کی ہے ضامن
تو جھوم کے بیٹھے وہیں میخانہ بنا دے

آجا مری آنکھوں میں سما جا مرے دل میں
اُجڑی ہوئی بستی کو بھی کاشانہ بنا دے

سُن لے نگہِ شوق کی بے تاب دعائیں
ہر ذرہ کو میرا دلِ دیوانہ بنا دے

اربابِ تمنا کی تمنا ہے گذارش
اس لفظ کو تو چاہے تو افسانہ بنا دے



غم آشنائے طبعِ غم ناشناس کیوں ہے
جو مجھ پہ ہنس رہا تھا اب وہ اداس کیوں ہے

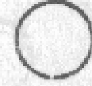
وجہِ فرامشی ہے تاثیرِ یاد — ورنہ
میں تجھ سے دُور کیوں ہوں تو میرے پاس کیوں ہے

کیا خوئے حُسن تیرے پیشِ نظر نہیں ہے
اے جذبۂ تمنا! مجروحِ یاس کیوں ہے

تم کہہ رہے ہو جو کچھ ایمان ہے وہ میرا
لیکن مجھے تمہارے ملنے کی آس کیوں ہے

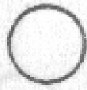
منظور تھا مٹانا آخر مٹا کے مانے
یہ کہہ کے خوش ہوئے ہیں غم تجھ کو راس کیوں ہے

جلوہ ذہین جب ہے جلوہ نگر کا طالب
غارتگرِ متاعِ ہوش و حواس کیوں ہے



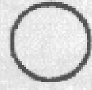
ہر اک لذت وقتی ہے ہر اک عشرتِ فانی ہے
لیکن نیرا دہ جلوہ جو وقتی ہے جو آنی ہے
یہ خواب میں ہے بیداری کیا غفلت میں ہشیاری کیا
او دُنیا کے دیوانے یہ دنیا ہی دیوانی ہے
جو تجھ کو دیکھنے والے ہیں وہ آئیں وہ مجھ کو دیکھیں
یعنی تیرا جلوہ ہی یہ میری حیرانی ہے
کاش کسی دن تم آؤ ایسے آؤ کہ میں نہ رہوں
یعنی میری آبادی مانوسِ ویرانی ہے
مرنے سے پہلے مر کر مٹ جائیں گے ہم تجھ پر
جان کسی دن جانی ہے موت کسی دن آنی ہے
پہلے جینا آساں تھا اب تو جینا مشکل ہے
آسانی دشواری ہے دشواری آسانی ہے

سامانِ بیہوشی ہے ہوش ذھین محبت میں
عقل محبت میں کیا ہے ایک جنوں سامانی ہے



مست نگاہوں والے ساقی مستوں کو متوالا کر دے
ایک نظر میں اک ساغر میں اپنا کر لے اپنا کر دے
جی چاہے تو پردہ رکھ لے جی چاہے تو رسوا کر دے
جیسا چاہے ویسا ہو جا جیسا چاہے ویسا کر دے
ساغر کر دے صہبا کر دے، ساغر و صہبا ہی کیا کر دے
مجھ کو میرا عالم کر دے مجھ کو میری دنیا کر دے
مجھ میں محوِ تماشا ہو جا، مجھ کو محوِ تماشا کر دے
جو کچھ بھی ہے ہونا ہو جا! جو کچھ بھی ہے کرنا کر دے
بھر دے میرا پیالہ ساقی تیرا بول ہو بالا ساقی:
مجھ کو مستِ مولیٰ کر دے مجھ کو سب سے اولیٰ کر دے
تو سورج ہے میں ہوں ذرّہ تو دریا ہے میں ہوں قطرہ
اس ذرّے کو سورج کر دے اس قطرے کو دریا کر دے

دل پَرور ہے دل آرا ہے دلبر تیرا کیا کہنا ہے
تو سب اچھوں سے اچھا ہے آج ذھین کو اچھا کر دے



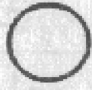
جب حاملِ صد حسنِ نظر ہم نہیں ہوتے
ہر ذرّے میں سَو حُسن کے عالم نہیں ہوتے

تو ہے کہ نہ ہونے سے ہے محفل میں نمایاں
ہوتے ہوئے محفل میں تری ہم نہیں ہوتے

تعظیمِ سخنہائے محبت ہے نظر میں
وہ راز سے واقف ہیں جو محرم نہیں ہوتے

قاتل کو یہ غم ہے کہ شہیدانِ محبت
نوحہ گرِ محرومیٔ ماتم نہیں ہوتے

تعبیرِ دو عالم سے ذہین اپنی خودی ہے
ہم ہوتے ہیں جس وقت دو عالم نہیں ہوتے



یہ دنیا ہے مگر دنیا نہیں ہے
تمہیں تم ہو کوئی تم سا نہیں ہے

تری محفل میں ہر شے دیدنی ہے
اگر بے دیکھنے والا نہیں ہے

نگاہِ عشق ہو یا پردۂ حُسن
شریکِ جلوۂ زیبا نہیں ہے

سراسر گوشۂ خلوت ہے یہ بزم
جہاں تم ہو کوئی اصلا نہیں ہے

کہاں جلوہ بقدرِ وسعتِ شوق
بہت دیکھا مگر دیکھا نہیں ہے

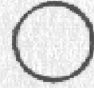
یہاں ہر چیز اب دیکھی ہوئی ہے
تمہیں دیکھا تو کیا دیکھا نہیں ہے

مجھے کیوں دیکھتا ہے ذرہ ذرہ
اگر تم نے مجھے دیکھا نہیں ہے

سوائے عشق ہم نے کچھ نہ جانا
نہ جانے عشق کیا ہے کیا نہیں ہے

ذہین اپنی نظر نے کیا نہ دیکھا
مگر اپنے سوا دیکھا نہیں ہے

BZSTRFT



سکونِ موت تک یا انتشارِ جسم و جاں تک ہے
خدا معلوم میری زندگی کی حد کہاں تک ہے

کہوں کیا کس قدر دوری قفس سے آشیاں تک ہے
یہی وہ فاصلہ ہے جو مرے دل سے زباں تک ہے

خلا کہتے ہو تم جس کو فضا کہتے ہو تم جس کو
یہ اک اجڑا ہوا عالم زمیں سے آسماں تک ہے

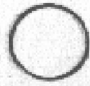
نہیں کچھ فکرِ بربادی مجھے غم ہے تو اتنا ہے
سمجھتا ہوں کہ برقِ آشیاں بھی آشیاں تک ہے

مزا جب ہے کہ اپنے ساتھ لا کر میرے مرقد پر
کوئی ان سے کہے طولِ غمِ فرقت یہاں تک ہے

یہ کہتا کون ہے تو چارہ سازِ دل نہیں ہوتا
یہ رونا ہے کہ تیرا علم کیوں دردِ نہاں تک ہے

نہیں درماندگی وارفتگی ہے شوقِ منزل میں
ہمارا خواب پا بھی ہم سفر کی داستاں تک ہے

ذہین اپنے عدم کی وسعتوں میں خوب پھر آیا
رہا احساسِ مستی سو درِ پیرِ مغاں تک ہے



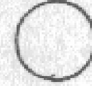
بیگانۂ کرم کا دل خوگرِ ستم ہے
اب تو کرم ستم ہے اب تو ستم کرم ہے

کیا حال پوچھتے ہو سب آپ کا کرم ہے
دل میں ہے درد، آہیں لب پر ہیں چشم نم ہے

آزادۂ محبت آزادِ ہر الم ہے
غمہائے زندگی کیا جب زندگی ہی غم ہے

وہ شوخیِ تبسم اس دل کو لے نہ ڈوبے
اللہ خیر، کل سے کیوں آج دردِ کم ہے

سب کچھ ہے دل میں جب وہ جانِ جہاں ہے دل میں
یہ دل ذہین اپنا دیکھو تو جامِ جم ہے



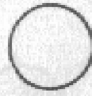
اب تک وہ بات صورتِ دردِ نہاں میں ہے
جو میرے لب پہ تھی نہ دلِ رازداں میں ہے

ہاں کون سی جفا نگہِ ناز میں نہ تھی
اب دیکھنا ہے کیا نگہِ امتحاں میں ہے

نظارہ حیرتی ہے مرے اضطراب کا
کیا آئینہ کوئی تپشِ رائیگاں میں ہے

رہتی ہے اک کشاکشِ پیہم خیال کو
خارج ہے جو یقیں سے وہ حدِ گماں میں ہے

ہستی سے اپنی دہر عبارت ہے اے ذھین
جب ہم نہیں جہاں میں تو پھر کیا جہاں میں ہے



تصور بڑھتے بڑھتے بڑھ گیا ہے
تری خلوت مری آغوش وا ہے

پشیمانی جفاؤں پر بجا ہے
مگر ایسا نہ ہو، یہ کب ہوا ہے

نہ دیکھا جائیگا کس طرح موسیٰ
ہمیں بھی ایک دن یہ دیکھنا ہے

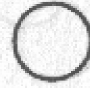
مآلِ صدمۂ غم گیتی ہے اک درد
یہی لے دیکے دل میں رہ گیا ہے

مصیبت ہو گئی آخر مساوات
وہ غم جو بامزا تھا، بے مزا ہے

یہ کیوں صورت چھپاتے ہو سرِ بزم
یہاں کوئی حقیقت آشنا ہے؟

ہمارا رنگ بھی ہے رازِ الفت
کہ جتنا اڑ رہا ہے کھل رہا ہے

ذھین ایمان لایا ہوں بتوں پر
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے



مکتبِ غم میں سبق آموز ہے — دل کہ محوِ عشرتِ امروز ہے

کائناتِ قلب پھر برہم ہے آج — پھر ترا جلوہ نظر افروز ہے

درد کی کیفیتیں ہیں بے شمار — دل بقدرِ ذوق، لطف اندوز ہے

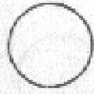
زندگی کے حق میں ہے امیدِ موت — عشرتِ فردا غمِ امروز ہے

کر رہا ہوں عیش میں کسبِ ملال — مجھ کو ہر سازِ طرب اک سوز ہے

غم کے لیتا ہے مسرت میں مزے — دل کہ لذت آشنائے سوز ہے

لے کے آیا ہوں دلِ صد چاک پھر — اے نگاہِ یار تو دلدوز ہے

ہم بھلے اور اے ذہینؔ افسردگی
جب بہارِ زندگی دو روز ہے



تصویر تیری مجھ سے اب تک کھنچی نہیں ہے
یا تجھ میں اور مجھ میں کچھ فرق ہی نہیں ہے

غم ایک ہے تو اُس کے دو مختلف اثر کیوں ؟
شاید کہ میرا رونا تیری ہنسی نہیں ہے

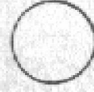
ایک آئینہ ہے میرے ہست و عدم کا اس میں
وہ بات جو ابھی تک تم نے کہی نہیں ہے

کس کشمکش میں ڈالا احساسِ بے خودی نے
بے ہوش بھی نہیں ہوں اور ہوش بھی نہیں ہے

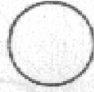
دیوانگی میں ہوشِ بے گانگی مبارک
کیا آگہی، جنونِ صد آگہی نہیں ہے

کس دل سے آرزوئے شوقِ وصال کیجے
کیا عاشقی رقیبِ ہر آگہی نہیں ہے

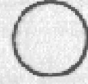
آخر ذہینؔ کیونکر سمجھاؤں چارہ گر کو
وہ درد بھی ہے دل میں جو درد ہی نہیں ہے



اب میری جستجو کو ذوقِ طلب نہیں ہے
جو بے سبب نہیں تھی غیرِ سبب نہیں ہے
دیوانہ رستگارِ قیدِ ادب نہیں ہے
شاید تری عنایت پہلی سی اب نہیں ہے
میں کس سے چاہتا ہوں اور کس کو چاہتا ہوں
کچھ میری آرزو کو پاسِ ادب نہیں ہے
یہ وعدۂ فریبِ دیدارِ حشر، توبہ
مٹ جائے ساری دنیا تو کچھ عجب نہیں ہے
چشمِ کرم نصیبِ اغیار ہو مجھے کیا
کیا دل نیاز مندِ چشمِ غضب نہیں ہے
ایسی بھی ہستیاں کچھ ہوں گی ذہین جن کو
دنیا میں غم کسی کا وجہِ طرب نہیں ہے



مجھ سے ہیں دور پاس ہیں میرے خیال سے
میں فاصلہ ہوں ہجر تک ان کے وصال سے
اتنا ہی مجھ کو واہمۂ ہجر سے ہے بعد
جتنا کہ میں قریب ہوں تیرے خیال سے
دیکھا تو تھا فریبِ نظر، منظرِ مجاز
میں دور تھا حقیقتِ حسن و جمال سے
وہ جس قدر نقوشِ حسیں تھے نظر نواز
اب محو ہوتے جاتے ہیں تیرے خیال سے
تیری ادائے ناز سے بھی اب ہوں بے نیاز
مایوس ہو چکا ہوں میں تیرے وصال سے
اب کھل گیا کہ حسن، حقیقت میں ہے وہ راز
آغاز جس کا ہوتا ہے میرے مآل سے
آئینہ ٹوٹ جائے تو بنتا ہے دل ذہین
چلتا نہیں ہے کام یہاں دیکھ بھال سے



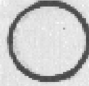
یاد آگیا وہ کوئی تبسم کہاں مجھے
آغوش میں وہ لینے لگیں بجلیاں مجھے

میری نظر میں آ کے نظر آ، نہیں تو پھر
اے برقِ حسن! تابِ تماشا کہاں مجھے

نکلا تھا کس طرح تری محفل سے یاد ہے
پھر جذبِ شوق کھینچ ہی لایا یہاں مجھے

ہنگامۂ حیات میں تنہائیِ خیال
حد ہو گئی کہ شورِ نفس ہے گراں مجھے

اتنے دل و نگاہ میں وہ بس گئے ذہین
ہوتا ہے اپنے آپ کا ان پر گماں مجھے



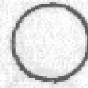
نگہِ لطف کی ہے دل کو تمنا تجھ سے
کہ ہو آباد یہ اجڑی ہوئی دنیا تجھ سے

نہ ہوا تو سرِ محشر بھی کسی کا افسوس
دلِ بیتاب کو امید تھی کیا کیا تجھ سے

تو وہ مختار کہ سنتا بھی ہے سنتا بھی نہیں
میں وہ مجبور کہ شکوہ بھی ہے تیرا تجھ سے

کٹ گئی عمرِ غمِ عشق بیک چشم زدن
فرصتِ حشر بھی ہے وقفۂ فردا تجھ سے

تو کہاں اور کہاں پرسشِ احوال ذہین
دم بخود ہوں کہ کہوں کیا نہ کہوں کیا تجھ سے



تری تجلیٔ پنہاں نظر نواز بھی ہے
حقیقتِ نگہِ شوق کا مجاز بھی ہے

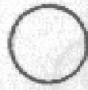
کسی کو بیخودیٔ شوق کی خبر ہی نہیں
حیاتِ عشق فسانہ ہے اور راز بھی ہے

جہانِ عشق میں کب معتبر ہے نام و نمود
یہاں اگر کوئی محمود ہے، ایاز بھی ہے

یہی خلش دلِ درد آشنا کو کیا کم ہے
کہ جس نے درد دیا ہے، وہ چارہ ساز بھی ہے

یہ دل ہے واقفِ آدابِ نازِ معشوقی
نہیں تو عشق تمنا سے بے نیاز بھی ہے

ذہین حسن و محبت میں کوئی فرق نہیں
برائے نام مگر ایک امتیاز بھی ہے



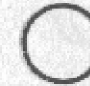
عرفانِ ذات مجھ کو ہاں ہے مگر نہیں ہے
یہ امرِ بےخودی پر کچھ منحصر نہیں ہے

میں خوش ہوں اس فنا سے جو باعثِ بقا ہے
جینے کی آرزو ہے مرنے کا ڈر نہیں ہے

خود کو بھلا چکا ہوں جلد آ کہ تجھ کو پوچھوں
اب اپنے حسن پر بھی میری نظر نہیں ہے

تیری سحر طرازی اب بھی ہے عام لیکن
دنیا مگر طلسمِ شام و سحر نہیں ہے

شاید ذہین غفلت تکمیلِ آگہی ہے
سب کچھ خبر ہے، لیکن کچھ بھی خبر نہیں ہے

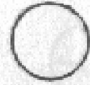


اثرِ عیش و غم نہیں رکھتے
دل ہی پہلو میں ہم نہیں رکھتے

دل ہے مُشتاقِ لذتِ کلفت
غم یہی ہے کہ غم نہیں رکھتے

آسماں سیر ہے خیال اپنا
ہم زمیں پر قدم نہیں رکھتے

میکشی اور ذہین کعبے میں
احترامِ حرم نہیں رکھتے



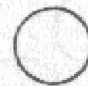
اب نصیحت وہ بھی فرمانے لگے
اے جنوں ہم تجھ سے شرمانے لگے

پھر ہجومِ بے قراری بڑھ چلا
پھر کسی کو یاد تم آنے لگے

کون ہے اب اس دلِ غم دوست کا
تم جفاؤں پر بھی پچھتانے لگے

کوئی جاتا ہے تو ہاں دنیا سے جائے
تم کسی کے کام کیوں آنے لگے

مُسکرا کر اس نے کیا دیکھا ذہین
ہم کمی سی درد میں پانے لگے



رازِ جنوں ہے ظاہر دامن سے آستیں سے
یہ مختصر فسانہ دیکھو کہیں کہیں سے

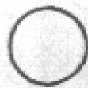
تم اپنے ناز کو بھی وجہِ نیاز سمجھو —،
یہ انجمن عبارت دیکھو تو ہے ہمیں سے

اپنے مشاہدوں سے فرصت نہیں ہے مجھ کو
میرا جہاں الگ ہے دنیائے کفر و دیں سے

اقرار میں فریبِ انکار، آہ ظالم!
ہاں ہو رہا ہے ثابت تیری نہیں نہیں سے

دل میں کبھی گزر ہو تو اے ذہین دیکھوں
نسبت ہے میرے دل کو کس شوخ نازنیں سے

Baba Zaheen Shah Taji RA Foundation Trust



خلوت میں ہے کیا جو سرِ بازار نہیں ہے
افسوس یہاں دیدۂ بیدار نہیں ہے

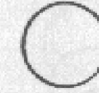
دل آرزوئے موت سے بیزار نہیں ہے
یہ تیری محبت کو سزاوار نہیں ہے

خاموش ہیں کیوں وادیٔ ایمن کی فضائیں
کیا کوئی یہاں طالبِ دیدار نہیں ہے

ہر چند کہ پرسش ہے بہائے غمِ الفت
افسوس کہ وہ پھر بھی خریدار نہیں ہے

کہتے ہیں ذہین اس لئے اب لوگ انا الحق
اس دور میں رسمِ رسن و دار نہیں ہے

BZSTRFT



ہم بتائیں گے تمنّاؤں کا حاصل کیا ہے
ہم دکھائیں گے کسی دن کششِ دل کیا ہے

شرحِ کم ہمّتیٔ اہلِ زمانہ آساں
کچھ ہمیں خوب سمجھتے ہیں کہ مشکل کیا ہے

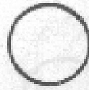
قابلِ صد صورِ برق ہیولائے جمال،
تو نے اس پر نہ کیا غور کبھی دل کیا ہے

حُسن آئینہ طلب اور حیا حجلہ پسند
ان سے خلوت میں یہ پوچھیں گے کہ محفل کیا ہے

ہو گئی ختم حدِ موت و حیات آکے جہاں
تم سے میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ منزل کیا ہے

وہ غم و رنج سے فارغ ہوئے جو ڈوب گئے
ورنہ گردابِ غم و رنج ہے ساحل کیا ہے

آئینہ دیکھنے والے نے نہ دیکھا یہ ذہین
یہ اگر عکس نہیں ہے تو مقابل کیا ہے



وہ آئیں تو آفت ہوتی ہے جائیں تو قیامت ہوتی ہے
جو سمجھا، وہ سمجھا نہ سکا کیا چیز محبت ہوتی ہے

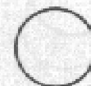
ہر درد سکون بن جاتا ہے ہر رنج میں راحت ہوتی ہے
وہ درد، دوا۔ وہ رنج، خوشی تم سے جسے نسبت ہوتی ہے

ہم چاک نہیں کرتے پردہ زاہد کے زہرِ ریائی کا
ہم ایسے گنہگاروں پر ہی اللہ کی رحمت ہوتی ہے

ہم غم سے ہیں غم ہے ہم سے کیا کام ہمیں دو عالم سے
کونین ملیں تو بھی نہ ملے وہ غم کی دولت ہوتی ہے

کچھ سمع خراشی کی حد ہے اچھا تخفیفِ تصدیعہ
افسانۂ غم طولانی ہے آپ کو زحمت ہوتی ہے

میخانے میں آکر دیکھ لیا سنتے تھے ذہین کہ متقی ہیں
کونین کے جھگڑوں سے حاصل انسان کو فرصت ہوتی ہے



حسنِ فطرت ہر جگہ سرمایۂ نظارہ ہے
ذرّہ ذرّہ میری آنکھوں کیلئے گہوارہ ہے

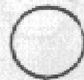
ہائے جو ذرّہ ہے وقفِ پائمالی بے خبر!
دیکھئے تو مصحفِ فطرت کا اک سیپارہ ہے

کیوں فضائے قدس مجھ کو جذب کر لیتی نہیں
ہر نفس باغِ جہاں میں نکہتِ آوارہ ہے

اب تو اے سوزِ دروں! کچھ بھی پتہ چلتا نہیں
میرے پہلو میں مرا دل ہے کہ اک انگارہ ہے

خوش نصیبی دیکھئے بے چارگانِ عشق کی
درد بھی ایسا ملا ہے اُن کو جو بے چارہ ہے

ہے محلِّ انقلابِ نو بنو قلبِ ذہین
ایک برقِ مرتعش ہے یا دلِ صد پارہ ہے



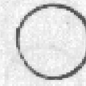
غمِ دل سازگار ہی کہیئے
اس خزاں کو بہار ہی کہیئے

حُسن کو عشق کار ہی کہیئے
راز کیا آشکار ہی کہیئے

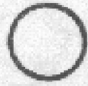
جو نہ کرنا تھا عشق میں وہ کیا
جبر کو اختیار ہی کہیئے

لاکھ رسوا سہی تمہارا عشق
پھر اسے پردہ دار ہی کہیئے

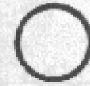
رندِ صد شیوہ ہے ذہین مگر
پھر بھی پرہیزگار ہی کہیئے



جو خلوتِ وصل میں خنداں ہے وہ عالمِ ہجراں میں بھی ہے
وہ صبحِ درخشاں میں بھی ہے وہ شامِ غریباں میں بھی ہے
اے محوِ فریبِ رنگ و بو! آزاد نگاہی پیدا کر
وہ ریگِ بیاباں میں بھی ہے وہ رنگِ گلستاں میں بھی ہے
وابستگی و وارستگیاں، سب حسن کی شانیں ہیں یعنی
وہ جعدِ معقد میں بھی ہے وہ زلفِ پریشاں میں بھی ہے
نیرنگِ مظاہر کے اجزا، بے رنگی کے آثار بھی ہیں
وہ عالمِ امکاں میں ہی نہیں وہ عالمِ امکاں میں بھی ہے
فانوس حجابِ شمع نہیں، آئینہ سترِ نگاہ نہیں
وہ پنہاں پیدا میں بھی ہے وہ پیدا پنہاں میں بھی ہے



پھر تجھ سے التجائے ہر زخمِ مندمل ہے
ہاں اے نگاہِ جاناں وہ غم کہ مستقل ہے
تم بجلیاں گرانا طور آفریں نظر سے
لیکن یہ دیکھ لینا پتھر نہیں ہے دل ہے
بیہوشِ آرزوئے ہر رنگ و بو ہے مجنوں
بیہوشیٔ جنوں خود اک کیفِ مستقل ہے
نادم ہو وہ جفا پر منظور کب ہے مجھ کو
خود میری سخت جانی قاتل سے منفعل ہے
بس کچھ نہ پوچھ ہمدم! اللہ جانتا ہے
یہ قلبِ مضطرب ہے یا دردِ متصل ہے
پھر اے ذہین دل کی حسرت وہی نظر ہے
جو دشمنِ نظامِ دنیائے آب و گل ہے



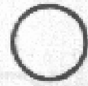
ادائے جانستاں جاں آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ دل آزار کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے

وہ کہتے ہیں نہیں میرے سوا ہرگز حسیں کوئی
مجھے ہر چیز دنیا کی حسیں معلوم ہوتی ہے

غضب تھا شوخیِ گفتار سے واقف مرا ہونا
وہ ہاں کہتے ہیں اور مجھ کو نہیں معلوم ہوتی ہے

میں جب سازِ طرب کو چھیڑتا ہوں ہر نوا اس کی
ہم آوازِ دلِ اندوہگیں معلوم ہوتی ہے

ذہینؔ آئی شبِ فرقت کہاں سے دوست کی خوشبو
صبا بردوش زلفِ عنبریں معلوم ہوتی ہے



محبت ہر خوشی سے بدگماں معلوم ہوتی ہے
مجھے ان کی ہنسی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

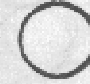
میں ہر آغاز میں انجام کی تصویر پاتا ہوں
بہار آتے ہی گلشن میں خزاں معلوم ہوتی ہے

نیازِ عشق آخر بے نیازِ دو جہاں نکلا
جبیں بھی آج ان کا آستاں معلوم ہوتی ہے

مرے اٹھتے ہی اٹھ جائیں گے سب پردے جدائی کے
مری ہستی حجابِ درمیاں معلوم ہوتی ہے

خرابی میں کوئی تعمیر کی صورت بھی ہو تو ہو
مجھے تو برق ہی اب آشیاں معلوم ہوتی ہے

ذہینؔ ان کی ادائے جاں فزا جانِ محبت ہے
مگر وہ دیکھنے میں جانستاں معلوم ہوتی ہے



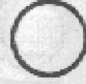
ہر نظر کیا آئینے کے دل سے پوچھا کیجیے
اپنی صورت میری آنکھوں سے بھی دیکھا کیجیے

جز نگاہِ عشق کب محرم ہے کوئی حُسن کا
آپ خود اپنی نگاہوں سے بھی پردا کیجیے

جب ہم آغوشِ نظر ہو جلوۂ زیرِ نقاب
کیوں برانگندہ نقابی کی تمنا کیجیے

ہر نظر آئینۂ محفل کے دل کا ہے جواب
ہو سکے تو دیکھنے والوں کو دیکھا کیجیے

عشق کے دل کی امانت ہے غمِ دل اے ذہین
مسکرا کر چھین لے کوئی تو پھر کیا کیجیے



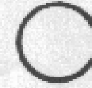
دل عشرتِ پیہم سے بیزار نہ ہو جائے
سازِ طربِ ہستی بیکار نہ ہو جائے

ناقص ہی سمجھنا تم تاثیرِ جنوں جب تک
جس پھول سے میں کہہ دوں وہ خار نہ ہو جائے

آتے ہوئے مرقد پہ شوخی سے وہ کہتے ہیں
پھر فتنۂ خوابیدہ بیدار نہ ہو جائے

دنیا میں مسرت کی صورت ہے مگر جب تک
دنیا پہ حقیقت کا اظہار نہ ہو جائے

اچھی ہے ذہین اپنی سرشاری و بیہوشی
مستی میں اگر یہ دل ہشیار نہ ہو جائے



مجھے تم دیکھ لو اپنی نظر سے
کہ دیکھوں آپ کو اپنی نظر سے

یہی ہے اقتضائے حُسنِ خود بیں
کہ تم چھپتے رہو اپنی نظر سے

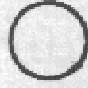
ہماری لغزشِ مستانہ کیا ہے
جو کہنا ہے کہو اپنی نظر سے

جسے سنتے ہی سنتے کوئی سو جائے
وہ افسانہ کہو اپنی نظر سے

وہ شرماتے ہیں عرضِ مدعا پر
کہیں ایسا نہ ہو اپنی نظر سے

ذہین اپنی نظر میں کیا ہے آؤ
دکھاؤں آپ کو اپنی نظر سے

Baba Zaheen Shah Taji RA Foundation Trust



عشق ہی مصلحت اندیش کبھی ہوتا ہے
ورنہ اے دوست جو ہم چاہیں وہی ہوتا ہے

یہ ہے آغاز تو انجام شبِ غم معلوم
دل سرِ شام چراغِ سحری ہوتا ہے

تم نے کیا کیا نہ غمِ عشق کی تدبیریں کیں
سچ ہے تقدیر میں ہوتا ہے وہی ہوتا ہے

میرے پہلو میں نہیں آپ کے پہلو میں سہی
دل کہیں قیدِ محبت سے بری ہوتا ہے

آئینہ خانے کو خلوت وہ سمجھتے ہیں ذہین
نگہِ شوق کا عالم بھی وہی ہوتا ہے

○

بے خودی میری تری آغوش ہے
یہ جنوں پروردۂ صد ہوش ہے

ہوش پرّاں ہیں کہ لرزاں ہے نقاب
تیرا پردہ ہے کہ میرا ہوش ہے

دیکھتا ہوں یا مقدر یا نصیب
قیمتِ جلوہ وداعِ ہوش ہے

اب نگاہ و بے نگاہی کا نصیب
تو بہر جلوہ گری روپوش ہے

ماورائے گفتگو ہے سرِّ عشق
ہر لبِ گویا لبِ خاموش ہے

تن محبت میں ہوا ہے دردِ سر
سر محبت میں وبالِ دوش ہے

ہے شہیدِ شانِ استغنا ذہین
جانے کیا کہنے کو وہ خاموش ہے

○

ہاں مجھ کو بزمِ ناز میں دیکھا نہ کیجئے
میرے مذاقِ عشق کو رسوا نہ کیجئے

مقصود ہے حجاب تو اتنا نہ کیجئے
ورنہ مرے خیال میں آیا نہ کیجئے

جلوہ اور اس ادا سے کہ پردا نہ کیجئے
جی چاہتا ہے آنکھ بھی اب وا نہ کیجئے

ہے کفرِ عشق آرزوئے غیر اس لئے
اپنے سوا کسی کی تمنا نہ کیجئے

جلوہ بقدرِ شوق و باندازِ شوقِ دید
دیکھا نہ کیجئے انھیں چاہا نہ کیجئے

یہ ہے علاجِ شکوۂ رسوائیٔ نظر
جب کوئی دیکھتا ہو تو دیکھا نہ کیجئے

اب حدِ موت سے بھی غمِ عشق بڑھ گیا
اب ان سے قتل کا بھی تقاضا نہ کیجئے

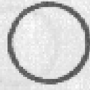
منظور مجھ کو کشمکشِ ضبط و اضطراب
ہاں اپنے التفات کو رُسوا نہ کیجئے

مجھ کو تو صبر تھا ستمِ گاہ گاہ پر
یہ بھی اگر برا ہے تو اچھا نہ کیجئے

اب تو ذہین یاس ہی انجامِ کار ہے
کیا کیا امید کیجئے کیا کیا نہ کیجئے

Baba Zaheen Shah Taji RA Foundation Trust

آیاتِ جمال



اور ستم کیا، کہا جب کہ ستم نہ کیجئے
اب یہ کہا کریں گے ہم، ہم پہ کرم نہ کیجئے

مجھ پہ کیا وہ غیر پر آپ ستم نہ کیجئے
عام خدا کے واسطے لذتِ غم نہ کیجئے

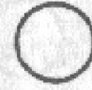
وجہِ طرب الم سہی، وجہِ الم طرب سہی
آپ نہ مسکرایئے شرحِ الم نہ کیجئے

پاسِ وفا اگر نہیں پاسِ حیا تو چاہیئے
دیر سے منہ اگر پھرے سوئے حرم نہ کیجئے

کعبہ و دیر و بتکدہ ہو کہ کنشت و صومعہ
جز درِ یار اے ذہین سر کہیں خم نہ کیجئے

BZSTRFT

Baba Zaheen Shah Taji RA Foundation Trust



کیفِ تمکیں ہے اضطرار مجھے
یونہی رہنے دو بیقرار مجھے

تجھ سے ہونا ہے ہمکنار مجھے
اب تو اپنا ہے انتظار مجھے

مجھ کو مٹنا تھا آہ کیوں نہ مٹا
کیوں رہا تیرا انتظار مجھے

کششِ حسن تا نہ ہو بدنام
نام کو ہے کچھ اختیار مجھے

اک طلسمِ فریبِ ہستی ہے
ورنہ کس کا ہے انتظار مجھے

جانتا ہوں کہ وہ نہ آئیں گے
پھر بھی ہے ان کا انتظار مجھے

ڈھونڈھتا ہوں نگاہِ یار کو میں
ڈھونڈتی ہے نگاہِ یار مجھے

مجھ کو اتنا مٹا کہ مٹ نہ سکوں
دیکھ پھر اے نگاہِ یار مجھے

زندگی کیا فنائے باقی سے
مانگ لائی ہے مستعار مجھے

میرے دل میں ہیں وہ ذہینؔ مگر
کاش آ جائے اعتبار مجھے

BZSTRFT